به این بهانه درین بزم محرمی جوییم
غزل سراییم و **پیغام آشنا** گوییم
اقبالؒ

شمارہ خاص: تمدنوں کی گفتگو

از هر چه می رود سخن دوست خوشترست
پیغام آشنا نفس روح پرورست
سعدیؒ

شمارہ ۵-۶
ربیع الاول ۱۴۲۲ھ/ خرداد ۱۳۸۰ش/ جون ۲۰۰۱ء

ثقافتی قونصلیت اسلامی جمہوریہ ایران، اسلام آباد

Marfat.com

فارغ از عالم

فقر فخر است اگر فارغ از عالم باشد

آنکه از خویش گذر کرد، چه‌اش غم باشد؟

طالع بخت در آن روز برآید که شبش — یار تا صبح وَرا مونس و همدم باشد

طرب ساغر درویش نفهمد صوفی — باده از دست بُتی گیر که محرم باشد

طوطی باغ محبت نرود کلبهٔ جُغد — بازِ فردوس کجا کلبِ معلّم باشد؟!

این دل گُم شده را یا به پناهت بپذیر

یا رَها ساز که سرگشتهٔ عالم باشد

دیوان حضرت امام خمینی ص ۸۶

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

Marfat.com

اقبال، رہبر معظم آیت اللہ خامنہ ای کی نگاہ میں

وہ ایک عبادت گزار، قرآن سے مانوس، اہل تہجد اور ممنوعہ چیزوں سے پرہیز کرنے والے تھے اور حتیٰ یورپ میں اپنے طالب علمی کے زمانے میں بھی انہوں نے اس روش کو ہرگز ترک نہیں کیا۔ قرآن پر ان کا اعتقاد اس حد تک زیادہ تھا کہ ان کے فرزند جاوید اقبال کے بقول قرآن کی آیتوں کو درخت کے پتوں پر لکھ کر بیماروں کو شفایابی کے لیے دیا کرتے تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، بیت اللہ اور حتیٰ حجاز سے جو وحی کا مرکز تھا، عشق کرتے تھے۔ اسلامی علوم میں ان کی دلچسپی اس قدر زیادہ تھی کہ عمر کے آخری ایام میں چاہتے تھے کہ اپنی سب کتابوں کو فروخت کر کے فقہ وحدیث کی کتابیں خریدیں۔ وہ عارفانہ سوز وگداز رکھنے والے انسان تھے۔

❁❁❁

Marfat.com

جناب سید محمد خاتمی

صدر اسلامی جمہوریہ ایران کے ۱۹ اکتوبر ۱۹۹۸ء کو یونیسکو
کے پیرس اجلاس میں خطاب سے
اقتباس

ثقافتوں اور تمدنوں کی گفتگو میں بات کرنے کے علاوہ سننا بھی لازمی ہے۔ سماعت کرنا ایسی فضیلت ہے کہ جسے حاصل کرنا چاہیے اور جو آسانی سے حاصل نہیں ہوتی، کیونکہ اسے حاصل کرنے کے لیے انسان کو اخلاقی تربیت، نفسانی تطہیر اور عقل کی نشو ونما کے سلسلے میں اقدام کرنا ہوتا ہے۔ سننے اور سکوت اختیار کرنے میں فرق ہے۔ سننا صرف ایک انفعالی اور اثر پذیرانہ عمل ہی نہیں، بلکہ ایک ایسا کام ہے جو اس بات کا موجب ہے کہ سامع اپنے وجود کو بات کرنے والے کی طرف سے خلق یا انکشاف کی گئی دنیا کے سامنے کھول کر رکھ دے۔ ہر گفتگو حقیقی سماعت کے بغیر ناکام ہو جاتی ہے۔

❀❀❀

Marfat.com

پیغام آشنا

سال دوم' شمارہ مسلسل ۵-۶
زمستان ۱۳۷۹- بہار ۱۳۸۰
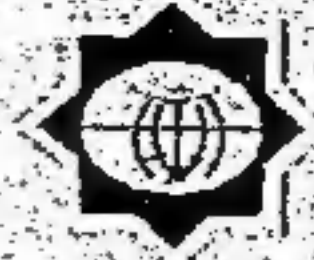
ربیع الاوّل ۱۴۲۲ھ/ خرداد ۱۳۸۰/ جون ۲۰۰۱ء

ایران اور پاکستان کے ثقافتی تعلقات کے بارے میں مطالعات اور تحقیقات پر مشتمل سہ ماہی مجلہ

مدیر مسؤول
ڈاکٹر رضا مصطفوی سبزواری' یونیورسٹی پروفیسر و ثقافتی قونصلر ج ا ا - پاکستان

سردبیر (افتخاری)
ڈاکٹر محمد سلیم اختر

مدیر داخلی
پروفیسر مقصود جعفری

مسؤول ھماھنگی ھا
عبدالرحیم حسن نژاد

نظارت فنی و مطبعی
جاوید اقبال قزلباش / توقیر حیدر

کمپوزنگ: ممتاز حسین آخوندزادہ ● طباعت: منزا پرنٹنگ پریس اسلام آباد

ثقافتی قونصلیٹ اسلامی جمہوریہ ایران - پاکستان
مکان نمبر ۲۵' گلی نمبر ۲۷' F-6/2' اسلام آباد
فون نمبر 8-2827937' فیکس 2821771

Marfat.com

هیأت تحریریه و مشاوران علمی

جناب ڈاکٹر رضا مصطفوی سبزواری	کلچرل قونصلر سفارت ج۔ا۔ا۔ اسلام آباد
جناب ڈاکٹر محمد سلیم اختر	پرنسپل ریسرچ فیلو قومی ادارہ تحقیق و ثقافت، اسلام آباد
جناب ڈاکٹر سید محمد اکرم	پروفیسر و صدر شعبہ اقبالیات، پنجاب یونیورسٹی، اسلام آباد
جناب ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری	ڈائریکٹر ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد
جناب ڈاکٹر بشیر انور	خانہ فرہنگ ج۔ا۔ ایران، ملتان
جناب افتخار عارف	صدر نشین، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد
محترمہ ڈاکٹر صغریٰ بانو شگفتہ موسوی	سابق صدر شعبہ فارسی، نمل، اسلام آباد
جناب مرتضیٰ موسوی	سابق ڈائریکٹر جنرل پاکستان نیشنل سنٹر، اسلام آباد
جناب ڈاکٹر غضنفر مہدی	سیکرٹری انجمن تاریخ و آثار قدیمہ، اسلام آباد
جناب ڈاکٹر سید علی رضا نقوی	سابق صدر شعبہ فقہ اسلامی، اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد

Marfat.com

فہرست

اداریہ

تمدنوں کی گفتگو

نذرِ اربعین حسینی

آئینہ ایران

اقبالیات

شخصیات

فارسی زبان وادب

Marfat.com

فنون

جائزہ کتب

منظومات

نئی کتابیں

اخبار

قارئین کے خطوط

چکیدہ فارسی

Marfat.com

حرف مدیر مسؤول

ہمیں خوشی ہے کہ گذشتہ چار شماروں کی اشاعت کے ساتھ مجلّہ پیغام آشنا نے اپنی تاسیس کا پہلا سال مکمل کرلیا اور اب وہ زندگی کے دوسرے سال میں داخل ہو رہا ہے۔

قارئین کرام کے محبت بھرے پیام، ان کے تعریف آمیز خطوط اور ارسال کردہ مقالے تمام کے تمام مجلّے کے شیدائیوں اور مشتاقوں کی طرف سے اس کے بے مثال استقبال کا واضح ثبوت ہیں جو اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ یہ مجلّہ کم عمری اور نیا ہونے کے باوجود سو سالہ راہ کو ایک ہی جست میں طے کرکے قارئین کرام کی توجہ اور عنایت کا مرکز بن چکا ہے۔

ہمیں مسرت ہے کہ دوسروں کی نگاہوں کے دریچوں سے اپنے آپ کو دیکھنے اور دوسروں کی زبانی اپنے حال کی کیفیت کو سننے کے امتحان میں ہم کامیاب ہو گئے ہیں۔ مجلّے کے ایک قاری نے مجلّے کے متعلق ازرہ لطف لکھا تھا کہ یہ مجلّہ شائع کرکے آپ نے ''سمندر کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔'' اسی طرح ایک اور قاری نے مجلّے کے مندرجات کی تعریف یوں کی کہ ''آپ ہمیں پاکستان کی ثروت مند تہذیب و ثقافت دوسروں سے زیادہ دکھاتے ہیں۔'' ایک اور صاحب نے لکھا کہ ''ماضی میں جب ہم یہ دیکھتے تھے کہ برصغیر کے تمام عظیم شعراء یہاں تک کہ پاکستان کے عظیم قومی شاعر کے پرافتخار اشعار اور آثار کا ستر فیصد سرمایہ، نیز پاکستان کی ثقافت و تمدن سے متعلق بہت سے قلمی نسخے فارسی زبان میں ہیں تو ایسے مجلّے کی کمی کو محسوس کرتے تھے۔ یہ مجلّہ پاکستان کی تہذیب و ثقافت سے متعلق فارسی اسناد، مآخذ اور منابع کی جانب توجہ مبذول کرا کے اس امر کا باعث بنتا ہے کہ ہم اپنی غنی و ثروتمند ثقافت اور تمدن کو زیادہ پہچانیں اور ان پر فخر کریں۔''

ہم ان تمام قارئین کرام اور پاکستان کے دانشوروں اور اہل علم و تحقیق کے شکر گزار ہیں جنھوں نے مجلّہ پیغام آشنا پر نگاہ عنایت کی ہے اور ہمیں امید ہے کہ آئندہ بھی مجلّے کی اشاعت کے سلسلے میں ان کی دعائے خیر اسی طرح ہمارے شامل حال رہے گی۔

Marfat.com

پیغام آشنا کے چوتھے شمارے کے ساتھ مرسلہ خط میں ہم نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ اگلے شمارہ کے بعض مقالات ''تمدنوں کی گفتگو'' کے موضوع پر ہوں گے۔ اس شمارے میں اس بات کا التزام کیا گیا ہے، اور موجودہ سال کے آخر تک پیغام آشنا کے آئندہ شماروں میں بھی یہ بحث جاری رہے گی۔ ہمیں امید ہے کہ صدر اسلامی جمہوریہء ایران جناب آقائے خاتمی کی یہ جدت بھری تعمیری تجویز اور اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی طرف سے اس کی منظوری دنیا کے مختلف ممالک خصوصاً ایران اور پاکستان کے دو ہم مذہب، ہم نسل، ہم ثقافت، ممالک کو ایک دوسرے سے نزدیک تر لانے میں اہم کردار ادا کرے گی۔

پروفیسر ڈاکٹر رضا مصطفوی

☆☆☆

Marfat.com

تمدنوں کی گفتگو

Marfat.com

وادی سندھ کے تمدن میں ایران کا کردار

پروفیسر ڈاکٹر رضا مصطفوی سبزواری☆

مترجم جاوید اقبال قزلباش

محترم چیئرمین جناب پروفیسر احمد آدم صاحب
صدارتی کمیٹی کے اراکین محترم!
معزز خواتین وحضرات!

السلام علیکم۔ اسلامی جمہوریہ ایران کے ثقافتی قونصلر کے طور پر میں اپنا فریضہ سمجھتا ہوں کہ پاکستان کی محترم حکومت اور قابل احترام یونیسکو کا شکریہ ادا کروں، جنہوں نے صدر اسلامی جمہوریہ ایران جناب محمد خاتمی کی طرف سے پیش کردہ تمدنوں کے مابین گفتگو کی تجویز پر، جسے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے بھی منظور کیا، یہ قابل قدر سیمینار منعقد کیا ہے۔

فارسی زبان کی عظیم لغت 'لغت نامہ دھخدا میں' جسے ایک لحاظ سے فارسی زبان کا انسائیکلوپیڈیا کہا جا سکتا ہے، معتبر مآخذ کی اساس پر سندھ کے ماضی کے بارے میں مرقوم (۱) ہے کہ یہ ایک مشہور ومعروف صوبہ ہے، جس میں کنوج اور لاہور جیسے شہر آباد ہیں، اور جو ہندوستان اور سیستان وکرمان کے درمیان واقع ہے۔"(۲)

مذکورہ مختصر تعارف کم از کم ایرانیوں کے ذہن اور زبان سے سندھ کی عظمت اور وسعت کا اظہار ہے کہ ایک تو وہ اسے "مشہور ومعروف" سمجھتے تھے اور دوسرے ان کے نزدیک اس کا جغرافیائی محل وقوع ہندوستان اور ایران کے مابین تمام علاقے پر محیط تھا۔ جغرافیہ کی مشہور کتاب ہفت اقلیم 'میں اس خطے کے تقدس اور حرمت کے متعلق یوں لکھا ہے "اس (سندھ) میں ایک صحرا ہے اور اس صحرا میں ایک گھر ہے جس کا نام بیت الذہب (سونے کا گھر) ہے اور اس گھر کے گرداگرد چار فرسخ تک برف باری نہیں ہوتی جبکہ باقی ماندہ تمام جگہوں میں برف برستی ہے۔ یہ صحرا صحرائے زردشت کے نام سے معروف ہے اور مجوس اب بھی اس کا احترام کرتے ہیں۔" سندھ کی یہ تعریف ہندوستان میں تالیف شدہ معروف لغت فرھنگ آنند راج (۳) میں بھی نقل ہوئی ہے، جو اس بات کی علامت ہے کہ صوبہ سندھ نہایت قدیم زمانوں

☆ کلچرل قونصلر اسلامی جمہوریہ ایران جناب پروفیسر ڈاکٹر رضا مصطفوی نے ۱۶ اپریل ۲۰۰۱ء کو وزارت ثقافت حکومت پاکستان اور یونیسکو کے تعاون سے منعقدہ سیمینار "وادی سندھ کا تمدن" میں شرکت کی اور مندرجہ بالا مقالہ پڑھا جسے صدر سیمینار اور مندوبین نے بہت سراہا۔

Marfat.com

سے ایرانیوں کی نگاہ میں محترم اور مقدس چلا آرہا ہے۔ اسی طرح مورخین کا اعتقاد ہے کہ جنوبی ایران کے علاقے شوش اور وادی سندھ کے لوگوں کے مابین قدیم زمانوں سے تجارتی اور ثقافتی روابط استوار رہے ہیں' اس لیے کہ موہنجوداڑو اور ہڑپہ کے کھنڈرات سے ملنے والے آثار قدیمہ وادی دجلہ وفرات کی سطوح مرتفع سے حاصل ہونے والے آثار سے بہت زیادہ مشابہت رکھتے ہیں۔ (۴)

ہخامنشی بادشاہ داریوش اول (تخت نشینی ۵۲۲؛ وفات ۴۸۶ ق م) نے اپنی حکومت کو جنوب مشرقی ایران سے لے کر دریائے سندھ تک وسعت دی (۵) اور سکندر اعظم (تخت نشینی ۳۳۶؛ وفات ۳۲۳ ق م) نے ہندوستان پر لشکر کشی کی اور وادی پنجاب تک بڑھ آیا۔ (۶) اس کی فوج میں ایرانی سپاہیوں کی موجودگی سے بھی جو اس بات کا سبب بنی کہ وہ ٹیکسلا (۷) سے سیالکوٹ تک پیش قدمی کرے۔ اس خطے میں ایرانی تہذیب وتمدن کی ترویج کے عوامل کا پتہ چلتا ہے۔ معتبر ایرانی متون کے مطابق نوشیروان کے دانشمند وزیر بزرگمہر نے پانسوں کے کھیل کی اختراع کی اور بعد میں اسے ایک خط کے ساتھ ہندوستان کے رائے (بادشاہ) کو تحفے کے طور پر بھیجا۔ (۸)

یکی نامہ بنوشت نزدیک رای
پر از دانش و رامش و هوش و رای (۹)
دگر گفت کای نامور رای هند
ز دریای قنوج تا پیش سند
کنون آمد این مؤبد هوشمند
به قنوج نزدیک رای بلند

شاہنامہ فردوسی سے، جو ایک معتبر ماخذ ہے، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایرانیوں نے پانسوں کے کھیل کا قابل قدر تحفہ پیش کر کے قنوج جو سندھی جغرافیہ کا حصہ اور آباد شہر تصور کیا جاتا تھا، کے لوگوں کی فکر کی تعمیر میں بنیادی کردار ادا کیا۔

شاہنامہ فردوسی کے مطابق، جو ازمنہ قدیم کی تاریخ کے حوالے سے ایک مستند تاریخی ماخذ ہے، ایران کے سندھ سے قریبی تعلقات نہایت قدیم زمانوں سے چلے آرہے ہیں۔ ہندوستان کا بادشاہ شنگل، سات دیگر بادشاہوں کے ہمراہ، جن میں شاہ سندھ بھی شامل تھا،

Marfat.com

ساسانی سلسلہ کے پندرھویں بادشاہ بہرام گور یا بہرام پنجم (تخت نشینی ۴۲۱ وفات ۴۳۸ء) سے ملاقات کے لیے ایران آیا:

برفتند در خدمتش هفت شاه
که آیند با رای شنگل به راه
یکی شاه کابل دگر شاه هند
دگر با سپه نزد او شاه سند (۱۱)

قابل توجہ بات یہ ہے کہ شنگل اور اس کے نامدار ساتھی، جن میں شاہ سندھ بھی شامل تھا، ساسانی بادشاہ بہرام گور کے ہاں دو مہینے تک مہمان رہے اور اس کے بعد بہرام اس کی سلطنت (سندھ) کا خراج معاف کر دیتا ہے:

چو بخشودنی باشد و تخت عاج
نخواهم زگیتی ازاین پس خراج (۱۲)

بیشک سربراہان مملکت کی سطح پر مذکورہ تعلقات نے ایران اور ہندوستان کے دونوں ممالک کے درمیان خیر سگالی کا جذبہ پیدا کرنے میں مدد دی۔ اس سے بھی اپنی ثقافت وتمدن کو سندھ تک پہنچانے میں ایران کا کردار کاملاً واضح ہو جاتا ہے۔

مذکورہ مستند دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ ایران کے سندھ کے ساتھ ہمیشہ قریبی تعلقات رہے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر ایک طرف ملک ایران کی قدامت اور دوسری طرف طویل دریائے سندھ کے زرخیز اور بابرکت کناروں پر آباد تمدن کو مدنظر رکھتے ہوئے جو قدیم ترین انسانی تہذیبوں میں سے ایک ہے، اور جس کی قدامت تین ہزار سے ڈیڑھ ہزار سال قبل مسیح تک پھیلی ہوئی ہے، اور پھر یہ بھی ذہن میں رہے کہ یہ دونوں ملک ایک دوسرے کے ہمسائے میں واقع ہیں، تو ان کے درمیان دیرینہ روابطہ کی موجودگی خود بخود اظہر من الشمس ہو جاتی ہے۔

اسلامی عہد میں اس خطے میں فارسی زبان کا کردار بالکل واضح ہے اور شاہ عبداللطیف بھٹائی (۱۱۰۰-۱۱۶۵ھ) اور سچل سرمست (۱۱۵۱-۱۲۴۴ھ) سمیت کئی دوسری شخصیات نے، جو عوام کے دلوں پر حکومت کرتی تھیں اور گلیوں بازاروں تک کے عام لوگوں کے دلوں میں ان کے لیے خلوص واحترام تھا، ایرانی تصوف وثقافت کی ترویج میں بڑا کردار ادا کیا۔

سندھ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک فارسی زبان میں کتبوں اور الواح کی موجودگی اس خطے میں ایرانی ثقافت اور فارسی کی موجودگی کا پتا دیتے ہیں۔ یہ کتبے اور الواح منجملہ اور

Marfat.com

چیزوں کے حکمرانوں اور شاہوں کی تاریخہائے وفات اور ان کے اوصاف و خصوصیات کا ذکر کرتے ہیں جن کی بذاتِ خود تاریخی اہمیت ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل لوح کو ایسی بے شمار الواح کے نمونے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے:۔ بروز سوموار بتاریخ ۱۴ رمضان ۱۰۱۹ھ، امیر شاہ قاسم ارغون بیگ لار، نے جو خاتم زمان اور شجاع دوران تھا، دار فانی سے عالم آخرت اور جوار رحمت الٰہی کے طرف رحلت کی۔(۱۵) اسی طرح مکلی ٹھٹھہ میں واقع امیر شمس الدین مکلی (۱۶) کے ایک اور کتبہ میں اسے بہادری میں ''رستم دستان'' سے تشبیہ دی گئی ہے۔ کبھی یہ کتبے اسلامی ثقافت کی ترویج اور امر بالمعروف کا کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں:

روز محشر کہ جان گداز بود
اولین پرسش (از) نماز بود (۱۷)

سال تاریخ این خجستہ بنا
گشت ظاہر ز مسجد الغربا
(۱۳۳۲ھ)

صنادید سندھ تالیف خان بہادر پروفیسر ڈاکٹر مولوی محمد شفیع، اور میراث جاودان تالیف ڈاکٹر کمال حاج سید جوادی، جیسے قابل قدر مآخذ و منابع خطہ سندھ میں موجود بہت سے فارسی خطوط اور اشعار کے سلسلے میں معتبر شواہد سمجھے جاتے ہیں۔ فارسی زبان میں ان الواح اور کتبوں کا وجود، جو تمام سرزمین سندھ میں پھیلے ہوئے ہیں، سندھ کی ثقافت و تمدن کی تشکیل میں فارسی زبان اور ایرانی ثقافت کے کردار کی ایک بین مثال ہیں۔ سندھی شعرا کے آثار میں فارسی زبان و ادب کا اثر مکمل طور پر آشکار اور اس بات کا مظہر ہے کہ انہوں نے سندھ کے ادب اور عرفان پرور خطے میں ایران کی تہذیب و ثقافت کی توسیع و ترویج میں بہت نمایاں حصہ لیا۔

عبدالحکیم عطا ٹھٹھوی (متولد ۱۰۴۷ھ) کا فارسی دیوان، اسی طرح اس کی مثنوی ہشت بہشت ایرانی ثقافت و ادب کے ایسے حقیقی پرتو ہیں جن سے سندھی اور ہندوستانی قارئین نے سالہا سال استفادہ کیا اور ان کے عرفانی افکار سے متاثر ہوئے۔ یہ نیک دل اور پاک سرشت صوفی شاعر اپنے اشعار میں شدید طور پر فارسی ادب سے متاثر نظر آتے ہیں۔

کمال عشق بہ یوسف بود گریبان گیر
نما معاینہ بیتابی زلیخا را (۱۹)

Marfat.com

جمال لیلی و آینہ دیدہ مجنونست
بجو ز سینہ وامق نشان عذرا را

اسی طرح اس خطے کے ایک اور اہم شاعر محمد محسن ٹھٹھوی (۱۱۲۱ھ ٹھٹھہ سندھ) کی مختلف معروف کتابوں مثلاً عقد دوازدہ گوہر، مثنوی طرز دانش ''اعلام ماتم یا حملہ حسینی'' (ابوطالب اصفہانی اور مرزا محمد رفیع باذل کی مثنوی حملہ حیدری کی تکمیل میں) یا خود دیوان محسن میں فارسی ادب بالخصوص حافظ، سعدی، طالب آملی، اور جامی کے گہرے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ محسن کے مثنوی نے ان کے اشعار کو تضمین بھی کیا ہے، اصولی طور پر محسن کے اشعار میں موجود اس کے عظیم افکار فارسی ادب میں منصور حلاج کی داستانوں کی یاد دلاتے ہیں:

از حرف حق کی گذرم گرچہ سر رود
منصور کی ملاحظہ دار می کند؟ (۲۱)

اسی طرح محمد محسن پر خسرو شیرین نظامی کا اثر اس کے مندرجہ ذیل شعر سے کاملاً ظاہر ہے:

کوھکن شد وقت شیرین کاری ای محسن تست
تیشہ کلکی بگیر و صفحہ جوی شیر کن (۲۲)

سچل سرمست (متولد ۱۱۵۷ در ازا رانی پور) خطہ سندھ کے عارف شعراء میں ہو گذرے ہیں۔ وہ منصور حلاج کی تعلیمات کے زیر اثر تھے جبکہ ان کا کلام ہمیشہ شیخ فرید الدین عطار نیشاپوری کی یاد دلاتا ہے۔ وہ اپنے فارسی کلام میں آشکار اور فدائی تخلص کرتے تھے۔ (۲۳)

عشق اندر دل ھر آن کس کار کرد
از کفر او را ز دین بیزار کرد (۲۴)

شیخ صنعان را ذرون کفر آورید
از محبت در گلو زنار کرد
پوست شمس الحق تبریزی کشید
ھمچنان مقتول شہ عطار کرد
زور عشقش چون بہ دل شبلی رسید
سر(ی)، از اسرار او اظہار کرد

Marfat.com

میاں محمد سرفراز خان کلہوڑہ سندھ کے مقتدر کلہوڑہ قبیلے سے تعلق رکھتے تھے ان کے والد میاں غلام شاہ سندھ کے حاکم اور شہر حیدر آباد کے بانی تھے۔ سرفراز خان کو فارسی زبان پر عبور حاصل تھا اور وہ متنوع صورتوں میں فارسی زبان میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ وہ غزل میں حافظ کے پیرو تھے اور کوشش کرتے تھے کہ ایرانی شعراء کی اصطلاحات اور تشبیہات مثلاً می گلفام، سیمیں بدن، ابرو کمان، تیر عشق، گل عذار، کو ہو بہو اسی صورت میں استعمال کریں (۲۵)۔ ان کی بعض غزلیں سعدی کی معروف غزلوں کی یاد دلاتی ہیں، مثلاً مندرجہ ذیل مطلع کے ہمراہ یہ غزل:

ای ماہ من بنشین دمی کز تن توانم می رود
نالہ کہ تو چون رفتہ ای از جسم جانم می رود (۲۶)

خطہ سندھ کے دوسرے فارسی گو شعراء بھی کسی نہ کسی طریقے سے ایرانی تہذیب و تمدن اور فارسی ادب کے ترویج کے عمل میں شریک رہے ہیں۔ مثلاً نواب غلام محمد خان لغاری تاجپوری (حیدر آباد) (متولد شعبان ۱۲۰۸ھ؛ وفات ۱۲۷۹ھ) صوفی منش تھے اور فارسی سے لگاؤ رکھتے تھے۔ ان کے والد علی محمد خان لغاری جو سندھ میں ٹھٹھہ کے حاکم تھے عالم، فاضل اور صوفی شخص تھے۔ دیوان غلام محمد خان جس میں غزلیں، رباعیاں، مسدس اور مفردات شامل ہیں، زیور طبع سے آراستہ ہو چکا ہے۔

مائل ٹھٹھوی ۱۱۸۱ھ میں سندھ میں متولد ہوئے۔ ان کے والد میر علی شیر قانع بھی شاعر، مورخ اور تذکرہ نویس تھے۔ انہوں نے نعت، مرثیہ، اور مادہ تاریخ میں ایرانی شعراء کے اسلوب، اور مضامین کی پیروی کی۔ ان کے آثار میں ساقی نامہ، مجمع البلغاء (جو سندھ کے فارسی گو شعرا کے احوال زندگی پر مشتمل ہے اور کلیات اشعار فارسی وغیرہ شامل ہیں۔ (۲۷) مائل کے فارسی اشعار ایرانی اصطلاحات و تعبیرات مثلاً ''نقد جان'' ''غلام زرخرید'' ''اسیر زلف خم دار'' ''چشم خمار'' اور ''طبع گہربار'' وغیرہ سے بھرے ہوئے ہیں۔ مذکورہ تعبیرات ان کی صرف ایک فارسی غزل سے لی گئی ہیں (۲۸) محمد اسماعیل فاروق (تولد جون ۱۸۹۰ء ٹنڈو محمد خان، وفات ۱۹۴۳ء) کا تخلص روشن تھا۔ آپ فاضل اور عارف شخص تھے۔ وہ تھرپارکر سندھ کے علماء کی جمعیت کے صدر، اور سندھ میں مسلم لیگ کے بانی تھے۔ انہیں فارسی ادب سے شدید لگاؤ تھا۔ فارسی زبان میں ان کی تالیفات میں انشائے روشن، منظوم اور منثور خطبے، نغمۃ الیمن کی پیروی میں نسیم چمن، جواہر نفیسہ (تصوف کے

Marfat.com

مسائل) وغیرہ شامل ہیں۔ ان کا فارسی دیوان چھپ چکا ہے[۲۹]

محمد ابراہیم خلیل ٹھٹھوی (متولد ۱۲۴۳ ہجری؛ ٹھٹھہ سندھ) ایک اور فارسی زبان سندھی شاعر میں جن کے آثار میں '' دیوان مسکین ، کشکول مسکین' دیوان خلیل اور مائدہ خلیل شامل ہیں۔[۳۰]

پاکستان کے صوبہ سندھ کے آثار قدیمہ اور وہاں کی تاریخی عمارتیں اس خطے میں ایرانی تہذیب وتمدن کے اثرات کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ اس لحاظ سے سندھ کا شہر ٹھٹھہ خاص طور پر اہمیت کا حامل ہے۔ مکلی کا قبرستان بھی اس شہر میں واقع ہے، جس کے فارسی کتبے اور اس سرزمین میں تاریخی عمارتوں پر نقش ونگار اور زیب و زینت ایران اور سندھ کے مابین ثقافتی روابط کی زندہ یادگاریں ہیں۔

اس کے علاوہ ٹھٹھہ کی معروف شاہجہانی مسجد میں، جو ۱۶۴۴ء میں تعمیر ہوئی، ایرانی فن معماری کے اثرات موجود ہیں۔

اسی طرح ٹھٹھہ شہر کی دیگر مساجد، خانقاہوں، مقبروں، مزاروں اور دوسرے متبرک مقامات پر نصب فارسی الواح اور کتبے سندھ کی وسیع سرزمین پر ایرانی ثقافت کی موجودگی کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔

کتاب میراث جاودان[۳۱] میں مذکورہ کتبوں کی تقریباً ایک سو پندرہ تصویریں اور اسی طرح صنادید سندھ[۳۲] کی تصویریں جن کے نیچے ضروری عناوین موجود ہیں، ساری کی ساری سندھی ثقافت کی تشکیل میں ایرانی اثرات کا واضح ثبوت ہیں۔ یہی نہیں بلکہ پاکستان اور دنیا بھر کے عجائب خانوں اور مخطوطوں کے ذخائر میں ایسے فارسی نسخے موجود ہیں جنہیں اہل علم و دانش نے لکھا ہے اور وہ سندھی تمدن میں ایرانی تمدن کے اثرات کی موجودگی کا پتہ دیتے ہیں۔

فارسی زبان کے وہ مخطوطے جو متنوع علمی و ادبی موضوعات پر تالیف ہوئے اور اب تک طبع نہیں ہوئے ایرانی دانش، فارسی ادب، آداب ورسوم سارے کے سارے ایرانی ثقافت کے مظاہر تصور کیے جاتے ہیں اور قارئین ان سے استفادہ کرتے رہے ہیں۔

ایک طرف تو یہ مخطوطے سرزمین سندھ میں کتابت کے مختلف اسالیب، زبان فارسی کی تحریر کے آداب ورسوم اور کتابوں کی آرائش ونقش ونگار کی ظرافت کو نمایاں کرتے ہیں تو

Marfat.com

دوسری طرف یہ واضح کرتے ہیں کہ یہ مخطوطے سالہا سال اہل علم و کتاب کی توجہات کا اس حد تک مرکز بنے رہے کہ انہوں نے ان کی نگہداشت میں سعی بلیغ انجام دی اور ان کتابوں سے بہرہ مند ہونے کے بعد انہیں بعد میں آنے والی نسلوں کے حوالے کر گئے۔ (۳۳)

مختلف ادوار میں ایرانیوں کی ایک بڑی تعداد سندھ آئی اور اس نے وہاں ایرانی تہذیب و تمدن کی ترویج و آبیاری کی۔ اب بھی ٹھٹھہ میں کاشانی، مشہدی، استر آبادی، اور شیرازی گھرانے موجود ہیں۔ (۳۴) مثال کے طور پر دو مشہدی بھائی سید یعقوب اور سید اسحاق ۹۰۱ھ میں سندھ آئے (۳۵) اور سید محمد عابد مشہدی کے دو بیٹے سید احمد اور سید محمد ۹۱۰ھ میں سندھ کے شہر ٹھٹھہ میں وارد ہوئے (۳۶) ان ایرانی گھرانوں، جن کی تعداد بھی زیادہ تھی اور پھر اس طرح ان کی اولادوں اور اولادوں کی اولادوں میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے دور میں کسی نہ کسی طریقے سے سندھ میں ایرانی تمدن کے انتقال اور فروغ میں موثر کردار ادا کیا۔

دسویں صدی ہجری میں ایران کے روابط سندھ کے شاہی دربار سے نہایت استوار تھے۔ شاہ سندھ سلطان محمود بھکری، جس کے اجداد اصفہان کے نواحی علاقے خراسکان کے باشندے تھے، شاہ طہماسب صفوی کی شدید توجہ کا مرکز بنا یہاں تک کہ سلطان کے سفیر کئی مرتبہ سلطان محمود کے پاس تحائف لے کر آئے۔ اسی طرح ۹۶۵ھ میں شاہ ایران نے سلطان محمود کو ''خان'' کا لقب عطا کیا (۳۸) جو بعد میں اس کے نام کا حصہ بن گیا اور بعد میں آنے والے تمام سندھی مورخین نے ان کا نام سلطان محمود خان بھکری تحریر کیا۔ (۳۹)

سندھی زبان و ادب بھی برصغیر ہند و پاکستان کی دیگر زبانوں اور ان کی ادبیات کی طرح شدید طور پر فارسی زبان و ادب سے متاثر ہوا۔ موجودہ سندھی زبان میں فارسی کلمات کی کثرت، سندھی شاعری پر فارسی عروض کے اثرات، نیز فارسی گرامر کا سندھی زبان کی گرامر پر اثر سرزمین سندھ میں ایرانی ثقافت و تمدن کے مظاہر میں سے ہیں۔

مآخذ

۱- لغت نامہ دھخدا، ذیل ''سندھ''
۲- دوسرے ایرانی منابع میں بھی ایسے ہی ہے: مثلاً جغرافیہ کی قدیم ترین فارسی کتاب حدود العالم (سال تالیف ۳۷۲ھ) میں یوں مرقوم ہے'' اس کے مغرب میں کرمان کا علاقہ واقع ہے۔'' یاقوت حموی

Marfat.com

(متوفی ۶۲۶ھ) کی کتاب معجم البلدان میں یوں تحریر ہے "السند بلاد بین الھند و کرمان و سجستان" زکریا قزوینی (متوفی ۶۸۲ھ) کی کتاب آثار البلاد و اخبار العباد میں بھی اس طرح لکھا ہے "السند ناحیۃ بین الھند و کرمان و سجستان"۔

۳- رک: محمد بادشاہ متخلص بہ شاد، فرہنگ آنند راج، ۳ مجلد، نولکشور، لکھنو، ۱۸۸۹ء-۱۸۹۲ء

۴- رک: علی اصغر حکمت، سرزمین ہند، انتشارات دانشگاہ تہران، ص ۳۶-۳۵

۵- ایضاً، ص ۱۸ نیز فرہنگ فارسی (معین)، تحت عنوان "داریوش"

۶- فرہنگ فارسی ڈاکٹر معین، اعلام، تحت عنوان "اسکندر"

۷- سرزمین ہند، ص ۱۹

۸- شاہنامہ کے عنوانات میں سے ایک یوں ہے۔ ساختن بوذر جمہر "نرد" راو بردن آن را با نامہ نزد رای ہند (شاہنامہ، ص ۴۶۰)

۹- شاہنامہ فردوسی، ص ۴۶۰

۱۰- رک: اسی مقالہ کا حاشیہ شمارہ (۲)

۱۱- شاہنامہ فردوسی، انتشارات امیر کبیر، ۱۳۶۹ اش، ص ۴۲۲

۱۲- ایضاً ص ۴۲۳

۱۳- سرزمین ہند، ص ۱۲

۱۴- اس امر پر توجہ کرتے ہوئے کہ جغرافیہ سے متعلق قدیم کتابوں میں سندھ کو ہندوستان، سیستان اور کرمان کے مابین قرار دیا گیا ہے۔ رک: لغت نامہ دھخدا، تحت عنوان "سند"۔

۱۵- مکلی کا قبرستان، ٹھٹھہ، منقول از ڈاکٹر حاج سید جوادی، میراث جاودان، اسلام آباد، سال چاپ ۱۹۹۲ء، ص ۳۸۲

۱۶- ایضاً، ص ۲۸۳

۱۷- ایضاً، ص ۲۱۵

۱۸- رک: دیوان عطا (عبدالحکیم عطا ٹھٹھوی) ہمراہ با تصحیح و مقدمہ سید محمد مطیع اللہ راشد، سندھی ادبی بورڈ، کراچی۔ حیدر آباد۔

۱۹- ایضاً، ص ۹

۲۰- دیوان محسن تتوی ہمراہ با تصحیح و مقدمہ محمد حبیب اللہ راشدی، سندھی ادبی بورڈ، حیدر آباد، ۱۹۶۲ء۔

۲۱- ایضاً، ص ۱۰۳

۲۲- ایضاً، ص ۲۰۲

۲۳- دیوان اشکار با اہتمام منشی بشن لال، لکھنؤ۔

۲۴- ایضاً، ص ۳۸

۲۵- رک: کلیات فارسی سرفراز، خضر عباسی نوشاہی، ۱۹۷۷ء، کراچی

Marfat.com

۲۶-ایضاً، ص۹۹
۲۷-رک: کلیات مائل، تصحیح محمود احمد عباسی ومحمد حبیب اللہ رشدی، سندھی ادبی بورڈ، حیدرآباد ۱۹۵۹ء
۲۸-ایضاً، ص۶۵
۲۹- دیوان روشن تصحیح ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، مہردلکشا، میرپور خاص، سندھ ۱۹۶۱ء
۳۰-مخدوم محمد ابراہیم خلیل تتوی، تکملہ مقالات الشعرا، تصحیح حسام الدین راشدی، سندھی ادبی بورڈ، ۱۹۵۸ء، کراچی۔
۳۱-رک: میراث جاودان، ج ۲، ص ۲۲۱ کے بعد
۳۲-رک: خان بہادر پروفیسر ڈاکٹر مولوی محمد شفیع، صناوید سندھ باہتمام احمد ربانی، ۱۹۷۰ء، کراچی۔
۳۳-رک: تہیہ وتنظیم انجم حمید، راہنمائی فہرست مشترک نسخہ ہای خطی فارسی پاکستان
۳۴-میر علی شیر قانع، مکلی نامہ، حواشی حسام الدین راشدی، سندھی ادبی بورڈ، حیدرآباد، ۱۹۷۶ء ص ۹۵
۳۵-ایضاً، ص۹۴
۳۶-میر علی شیر قانع، تحفۃ الکرام (سندھی)
۳۷-رک: معجم البلدان، ج ۲، نیز فرہنگ جغرافیای ایران، ج ۱، ۲۱۶-۸۰
۳۸-میر معصوم، تاریخ سندھ، ص۲۲۳
۳۹-ایضاً

☆☆☆

Marfat.com

تمدنوں کی گفتگو کے حوالے سے بین الجامعاتی مباحثہ

جواد فلاح
مترجم جاوید اقبال قزلباش

اسلامی جمہوریہ ایران کے صدر ڈاکٹر سید محمد خاتمی کی طرف سے تمدنوں کی گفتگو کی تجویز نے مشرق کو ایک بار پھر دانشوروں اور مفکروں کی توجہ کا مرکز بنا دیا ہے۔ انسانی تاریخ جنگوں، نسل کشی اور انسانوں کے ایک دوسرے کے استحصال سے بھری پڑی ہے اور صدیاں گذر جانے کے باوجود اشرف المخلوقات حضرت انسان اپنی تمام صلاحیتوں کے باوجود مطلق مسرت اور نجات کی منزل حاصل کرنے کے لیے دنیا کی پوشیدہ قوتیں بروئے کار نہیں لا سکا ہے۔

تمام انسانی تاریخ میں نااتفاقیوں، جھگڑوں اور عدم مفاہمت کا تصفیہ کرنے کے لیے جنگ اور خون ریزی ایک عام پالیسی رہی ہے۔ مختلف ثقافتوں اور تمدنوں کے درمیان تنازعات اور دشمنیوں کی سب سے بڑی وجہ کو شاید دوسروں کے افکار اور اصولوں کے متعلق لاعلمی اور عمومی معلومات کے نہ ہونے سے منسوب کیا جا سکتا ہے' جیسا کہ پیغمبر اسلامؐ نے بجا طور پر فرمایا '' لوگ جس چیز کو نہیں جانتے اس کے دشمن ہو جاتے ہیں۔'' چنانچہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ تمدنوں کے درمیان گفتگو مختلف قوموں کے درمیان موجود غلط فہمیوں کو ختم کرنے کی ضمانت دے سکتی ہے۔

مواصلات اور سفر نیز باہمی سائنسی اور ثقافتی تعامل کے شعبوں میں ترقی نے ہمیشہ سے زیادہ گفتگو کے لیے راستہ ہموار کیا ہے۔

درآنحالیکہ فوجی جرنیل اور جنگجو تشدد اور ٹکراؤ کی ڈپلومیسی پر عمل کرتے ہیں گفتگو اور افہام و تفہیم کی ڈپلومیسی مفکرین، دانشوروں اور ماہرین تعلیم کی فعال شرکت کی مرہون منت ہوتی ہے۔

فقط یونیورسٹیاں وہ ادارے ہیں جنہیں تمام دوسروں سے زیادہ فعال کردار ادا

☆ بشکریہ ماہنامہ محجوبہ، جلد ۲۰ شمارہ ۱ جنوری ۲۰۰۱ تہران

Marfat.com

کرنے کی ضرورت ہے۔ اس واجب وخطیر فریضے کو انجام دینے کے لیے تہران یونیورسٹی آف میڈیکل سائینسز اینڈ ہیلتھ سروسز نے ۲۰۰۰ء کے ابتدا میں تمدنوں کے مابین گفتگو کا بین دانشگاہی سیکرٹریٹ قائم کیا اور تین قومی اور بین الاقوامی منصوبے بنائے جنھیں محکمہ صحت کے حکام نے منظور کیا۔ اس یونیورسٹی کے ثقافت وامور طلبا کے مہتمم جناب ڈاکٹر ضیائی نے ماہنامہ مجوبہ سے تبادلۂ خیال کرتے ہوئے فرمایا:

ڈاکٹر ضیائی: ۱- اگر انسان یہ مصمم ارادہ کرے کہ وہ اجازت نہیں دے گا کہ تاریخ خود کو دہرائے اور ناگاساکی اور ہیروشیما، کوریائی اور ویت نام جیسی جنگیں نیز دنیا کے مختلف حصوں میں نسل کشی کے واقعات دوبارہ واقع ہوں تو اسے تمدنوں کے درمیان گفتگو کے اختیار کو معاشرے کی تمام سطحوں پر فوری، مخلصانہ اور سنجیدہ توجہ دینی چاہیے۔

۲- تہران یونیورسٹی آف میڈیکل سائنسز اینڈ ہیلتھ سروسز اور اس کی اعلیٰ انتظامیہ تمدنوں کے مابین گفتگو شروع کرنے اور اسے وسعت دینے نیز اپنے طالب علموں کی دوسرے ممالک، ثقافتوں اور تمدنوں سے متعلق معلومات کی سطحیں بلند کرنے کے لیے تمدنوں کی گفتگو پر بین الجامعاتی مذاکرے ومباحثے منعقد کرانے اور اسے فروغ دینے پر خاص توجہ دے رہی ہے۔

اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے یونیورسٹی کی تجویز ہے کہ ۲۰۰۱ء میں ''عالمی ممالک کا ہفتہ'' منایا جائے جس میں دنیا کے مختلف مہمان ممالک کو اپنی ثقافت، تاریخ، تمدن اور فنی وسائنسی حاصلات کو مختلف نمائشوں، فلموں، تحقیقی نمائشوں، تقاریر، گول میز کانفرنسوں اور کلاسیکی وروایتی موسیقی میلوں کے ذریعے پیش کرنے کی دعوت دی جائے۔

۳- اس کے ساتھ ساتھ یہ تجویز بھی ہے کہ ایرانی دانشوروں اور ماہرین تعلیم کا ایک گروپ ایران اور مہمان ممالک کے مابین باہمی تعلقات کی ثقافت وتمدن کا تعارف پیش کرے۔

اب تک یورپ، ایشیا، افریقہ اور جنوبی امریکہ کے ۲۵ ممالک نے اس بین الاقوامی بین الجامعاتی تقریب میں شرکت کی حامی بھر لی ہے۔

۴- ایک تجویز یہ بھی پیش کی گئی ہے کہ دنیا بھر کی ۴۰ یونیورسٹیوں کے نمائندہ طالب علم، جن کا مختلف نسلوں اور لسانی وثقافتی پس منظروں سے تعلق ہو، پانچ مختلف بیس پوائنٹس سے ایران کے معروف پہاڑ دماوند کی چوٹی کو سر کریں جبکہ ہر گروپ اولمپک نشان کے ۵

Marfat.com

رنگوں میں سے ایک اٹھائے ہوئے ہو اور چوٹی پر وہ اس نشان کو باہم مل کر مکمل کریں۔
یہ عمل اتحاد و یکجہتی کے اظہار کے علاوہ اس بات کی علامت بھی ہوگا کہ تمدنوں کے درمیان گفتگو کی تازہ سوچ کو پیش کرنے پر بحیثیت میزبان ایران کی قدردانی کی جائے۔

۵- بہر حال یہ بھی بہت ضروری ہے کہ بعض ایسے حالات اور عناصر پر توجہ دی جائے جو گفتگو کے عمل کی کامیابی میں رکاوٹ بن سکتے ہیں۔ ان عناصر میں جہالت، اور معاشروں کے مختلف حصوں میں اقتدار کی کشمکش اور اندھا استبداد شامل ہیں۔ جب تک مختلف حکومتی سطحوں پر دانشور اور مفکر فیصلے کرنے میں سرگرم نہ ہوں گے یہ عمل ایک خواہش و تمنا ہی رہے گا۔ دنیا کے سیاستدانوں، مفکروں، اور ماہرین تعلیم کو عالمی سطح پر پائیدار امن و ترقی کے حصول کے لیے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر کام کرنا ہوگا۔

۶- اہم بات یہ ہے کہ دنیا کے تمام ممالک اور ان کی منفرد ثقافتوں اور تمدنوں کو، قطع نظر ان کی اقتصادی اور فنی مقامات کے، برابری کی بنیاد پر جائز اہمیت دی جائے۔

۷- بقول آقائے خاتمی کے، ہم ایک ایسے مذہب کے پیروکار ہیں جس کا سب سے بڑا معجزہ کلام ربانی ہے۔ منطق اور گفتگو مسلمانوں کے لیے اجنبی تصورات نہیں ہیں۔ قرآن عظیم نے لوگوں کو متواتر حکمت کی طرف بلایا ہے۔ ''بات کو سننا اور اس میں سے بہترین کی پیروی کرنا'' (۳۹:۱۸) لہٰذا یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ مختلف تمدنوں کے درمیان بہتر اور محکم تر تعلقات استوار کرنے کی غرض سے سول اور پرامن گفتگو کی تجویز کے سلسلے میں اس روحانی و معنوی کتاب کے ماننے والے پیش پیش رہیں جو (کتاب) امن، اتحاد اور بھائی چارے کی عالمی دعوت دیتی ہے۔

☆ ☆ ☆

Marfat.com

تہذیبوں کے درمیان تصادم یا تفاہم

پروفیسر سردار نقوی (مرحوم)

اسلامی جمہوریہ ایران کے صدر محترم جناب سید محمد خاتمی نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے ۵۳ ویں اجلاس میں تقریر فرماتے ہوئے تجویز کیا کہ "سن ۲۰۰۱ء کو تہذیبوں کے درمیان مکالمے کا سال قرار دیا جائے۔"

اس تجویز کی اہمیت کیا ہے؟ اس کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی؟

تہذیبوں کے درمیان مکالمے کا انسانیت کی تقدیر اور مستقبل کی تاریخ سے تعلق کس نوعیت کا ہے؟

ایک ایسے ملک کے صدر نے جو دنیائے معاصر میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی علامت سمجھا جاتا ہے اقوام متحدہ کے فورم سے اس تجویز کو اس قدر اہمیت کے ساتھ پیش کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی؟

ان سوالات پر غور کرنا ہر صاحب عقل و شعور کی ذمہ داری ہے لیکن اس مسئولیت سے صحیح طرح عہدہ برآ ہونا اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکے گا جب تک ہم ان مسائل پر اس عہد کے سیاسی، تمدنی اور تاریخی حالات کے تناظر میں غور کرنے کی کوشش نہ کریں۔

بیسویں صدی کا آغاز ایک ایسی فضا میں ہوا جب فکر انسانی کے افق پر مادی نظریات کے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ ۱۹۱۷ء کا اشتراکی انقلاب روحانیت کے زوال اور مادیت کے غلبے اور کمال کی علامت سمجھا گیا۔ اس انقلاب کے نتیجے میں پوری دنیا دو بڑے نظریاتی بلاکس (Blocks) میں تقسیم ہو گئی یعنی اشتراکی دنیا اور آزاد دنیا (Free world)۔ ان دونوں فریقوں کے درمیان محاذ آرائی اور کشمکش کی ایک مستقل فضا تھی جسے سیاسی اصطلاح میں سرد جنگ (Cold War) سے تعبیر کیا گیا اور فکری سطح میں تاریخ کے اس دور کو نظریاتی جنگ کا دور قرار دیا گیا۔

۱۹۷۹ء میں ایران کے اسلامی انقلاب نے عالمی سیاست کے منظرنامے کو یکسر منقلب کر دیا۔ اپنے ہمہ گیر سیاسی، فکری اور تہذیبی اثرات کے لحاظ سے اس انقلاب کو نہ صرف اس صدی بلکہ تاریخ بشریت کے عظیم انقلابات میں شمار کیا جائے گا۔ یہ انقلاب معاصر تاریخ میں مذہب کے نام پر رونما ہونے والا وہ پہلا انقلاب ہے جس نے مادیت کے مقابلے میں روحانیت کی فتح و کامرانی کا پرچم بلند کیا۔ اس انقلاب نے بشریت کی فکر کا زاویہ اور تفکر کی جہت تبدیل کر دی اور تاریخ کے دھارے کا رخ موڑ دیا۔ اس انقلاب کا

Marfat.com

سرچشمہ فکر اسلامی ہے اور اس کا ہدف اسلام کی اس حقیقی فکر کی بازیافت ہے جو اللہ کی بندگی کے حوالے سے انسانوں کے لیے آزادی کی بشارت ہے اللہ کی وحدانیت کے حوالے سے انسانیت کی وحدت کی علامت ہے اور انسانیت کی وحدت کے حوالے سے انسانوں کے درمیان عدل اور مساوات کی ضمانت ہے۔

انقلاب اسلامی کی یہی وہ فکر بنیادیں ہیں جو انسانیت کی تاریخ و تہذیب میں بنیادی تبدیلیوں کا سرچشمہ ہیں اور جو دنیا کی مظلوم اور محروم اقوام مستضعفین کو استعماری طاقتوں اور مستکبرین کے خلاف مقاومت اور مبارزت کا حوصلہ عطا کرتی ہیں۔ مغرب کے استعماری نظام کے لیے اصل خطرہ ایران کے انقلاب اسلامی کی یہی فکری اساس ہے جس نے تمام دنیا میں بیداری کی ایک نئی لہر پیدا کر دی ہے۔

کمیونزم کے زوال کا سرچشمہ یہی انقلاب ہے۔ رہبر انقلاب حضرت روح اللہ خمینی نے اس وقت کے روسی صدر گورباچوف کے نام اپنے تاریخی خط میں واضح طور پر یہ پیشگوئی فرمادی تھی کہ اشتراکیت کا زوال یقینی ہے اور اب اس کی جگہ صرف تاریخ کے عجائب گھر میں ہوگی۔ افغانستان میں روسی فوجوں کی شکست سے لے کر روس کی عالمی طاقت کے عبرت انگیز زوال تک تاریخ کے بہاؤ نے اس پیشین گوئی پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔

روسی طاقت کا زوال دو قطبی دنیا کا خاتمہ اور تاریخ میں نظریاتی جنگ کے دور کے اختتام کی علامت ہے۔

دو قطبی دنیا کے خاتمے کے بعد مغرب کا استعماری نظام جس کی سربراہی امریکہ کے پاس ہے تمام کرۂ ارض پر اپنے تسلط اور اقتدار کی منصوبہ بندی میں پوری طرح سرگرم عمل ہو گیا۔ اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جو نعرہ بلند کیا گیا ہے وہ ہے (Globalisation) کا نعرہ ہے اور جو نظریات پیش کیے گئے ہیں ان میں سے ایک اختتام تاریخ اور دوسرا تہذیبی تصادم کا نظریہ ہے۔

گلوبلائزیشن (Globalisation) کا مقصد ایک عالمی تہذیب کی ضرورت اور افادیت کے نام پر تمام دنیا پر مغربی تہذیب کے ان ظواہر کو مسلط کرنا ہے جو مغربی استعمار کے غلبہ کی راہ ہموار کر سکیں۔ جبکہ اختتام تاریخ (End of History) کا نظریہ جسے فرانسس فوکویاما (Fukuyama) نے پیش کیا اس بات کا مدعی ہے کہ موجودہ مغربی امریکی تہذیب جس کی بنیاد سیکولرزم لبرلزم اور جمہوریت ہے نظریاتی اور فکری ارتقاء کی وہ آخری حد ہے جسے تاریخ فکر کے سفر ارتقاء کے اختتام سے تعبیر کیا جانا چاہیے۔ اس لیے انسانیت کی ترقی کا پیمانہ اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس تہذیب کو واحد عالمی تہذیب کے طور پر قبول کر لیا جائے۔

Marfat.com

تہذیبی تصادم (Clash of Civilization) کا ہنٹنگٹن (Samuel P.Huntington) نے پیش کیا' وہ اس بات کے مدعی ہیں کہ مستقبل کی تاریخ تہذیبوں کے تصادم سے عبارت ہے۔ ان کے خیال میں مغرب کی مادی تہذیب انسانوں کو ترقی اور کمال کی طرف لے جا رہی ہے جبکہ اسلام کی روحانی ثقافت تاریخ کو ماضی کی طرف دھکیل رہی ہے۔ اس لیے ان دونوں تہذیبوں کے درمیان تصادم ناگزیر ہے۔

یہ ان مباحث اور مسائل کا ایک اجمالی خاکہ ہے جن کے تناظر میں اسلامی جمہوریہء ایران کے صدر نے اقوام متحدہ کے فورم سے تہذیبوں کے درمیان مکالمہ کی تجویز پیش کی۔

پاکستان میں اسلامی جمہوریہء ایران کے محترم سفیر جناب سراج الدین موسوی اس تجویز کے مفادات اور مضمرات پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

اسلامی جمہوریہ ایران کے صدر نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے ۵۳ ویں اجلاس میں یہ تجویز پیش کی کہ عالمی عدل اور آزادی کے قیام کے لیے اولین قدم کے طور پر ۲۰۰۱ء کو اقوام متحدہ کی طرف سے عالمی تہذیبوں کے درمیان مکالمہ کا سال قرار دیا جائے۔ وہ (صدر ایران) اس بات کے قائل ہیں کہ اگر انسان آزادی فکر' منطقی گفتگو اور قانون کی عملداری کو اپنے معاشرتی کردار کا معیار بنالیں تو یہ روش انسانی تہذیبوں میں انفرادی اور معاشرتی رشد و ترقی میں بڑا اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ تہذیبوں کے درمیان مکالمے کا نظریہ ایک وسیع تناظر میں اور ایسی ہی فکر کے نتیجے کے طور پر سامنے آیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسانی تہذیبیں اپنی کثرت اور تنوع کے باوجود آپس میں قربت اور باہمی اشتراک اور تعاون کے جوہر کو پہچانتے ہوئے باہمی مکالمے کا آغاز کریں۔ کیونکہ نقادانہ اور مسلسل مفاہمت کا عمل ہی کسی تہذیب کو مزید ثروت مند بنا سکتا ہے۔ یہ مکالمہ' تبادلہء خیال اور قربت افکار کا دروازہ کھول سکتا ہے اور نوع بشر کو فلاح اور سعادت میں مدد دے سکتا ہے۔ اس تعامل میں وہ تہذیبیں جو دینی الٰہی افکار کی بنیاد پر استوار ہیں انسانی روابط کے حوالے سے اس خلا کو پر کرنے میں مدد دے سکتی ہیں جس سے مغربی معاشرے دوچار ہیں' اور ساتھ ہی ساتھ مغرب کی سائنسی اور صنعتی ترقی سے صحیح طور پر استفادہ بھی کر سکتی ہیں۔ میری رائے میں عالم اسلام اور اسلام کی ثروتمند تہذیب اس تعامل میں انتہائی تعمیری کردار ادا کر سکتی ہے۔ یہ امر اس بات کا متقاضی ہے کہ تمام اسلامی ممالک اسلامی جمہوریہ ایران کے صدر کی اس تجویز کا گہری نظر سے مطالعہ کریں اور اس حوالے سے ایک مشترکہ موقف اختیار کیا جائے۔

بے شک صدر ایران کی یہ تجویز اس بات کی مستحق ہے کہ اس پر پوری سنجیدگی' دیانت داری اور دانشمندی کے ساتھ غور و فکر کیا جائے۔

اس کے لیے سب سے اہم اور بنیادی ضرورت مغربی تہذیب کے تاریخی اور فکری پس منظر سے آگاہی حاصل کرنا ہے۔ اسلامی جمہوریہ ایران کے محترم صدر کا شمار اہل علم و

Marfat.com

دانش کے اس مختصر اور منتخب حلقہ میں ہوتا ہے جو مغرب کی تہذیب و تاریخ اور اس کی سیاست و ثقافت کی فکری اور علمی بنیادوں سے مکمل آگاہی رکھتے ہیں۔ جس کا ثبوت ان کی بصیرت افروز تقاریر اور وہ فکر خیز قلمی آثار ہیں جو کتابی صورت میں مدون کیے جا چکے ہیں۔ اس حوالے سے ان کی ایک قابل قدر کتاب از دنیای شہر تا شہر دنیا ہے جس میں عہد یونان سے عصر حاضر تک مغرب کے سیاسی افکار کی تاریخ کا عملی مطالعہ اور تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ جناب سید محمد خاتمی کی ایک اور کتاب جس کا نام بیم موج ہے ان پانچ گرانقدر مقالات پر مشتمل ہے جن کا موضوع عصر حاضر کے تناظر میں اسلامی علوم و معارف کا مطالعہ ہے۔

کتاب دنیای شہر تا شہر دنیا ہمیں مغرب کے فکری منظر سے متعارف کراتی ہے۔ مغرب کی طرف عالم اسلام کا رویہ عموماً موضوعاتی اور جذباتی ہے۔ وہ جو مغرب سے بیزار اور متنفر ہیں یا وہ جو مغرب سے مسحور اور متاثر ہیں دونوں کا رویہ جذباتیت کا مظہر ہے۔

مغرب ایک واقعیت ہے، محکم اور مسلم، جو گزشتہ نصف ہزار سال سے انسانیت کی تاریخ و تقدیر کو متاثر کر رہی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس واقعیت سے علمی اور سائنسی بنیادوں پر آگاہی حاصل کی جائے۔ مغرب کے حوالے سے جذباتی تردید یا اندھی تقلید کی بجائے ایک مثبت اور صحت مند تنقیدی شعور کو بیدار کیا جائے کہ اس کے بغیر عصر حاضر اور اس کے تقاضوں سے آگاہی حاصل کرنا ممکن نہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ اسلام کی آفاقی تعلیمات اور تہذیب اسلامی کی عالم گیر اقدار کو عصر حاضر کے تقاضوں سے مربوط اور ہم آہنگ کرنے کے لیے علوم و معارف اسلامی کے مطالعے کے لیے تازہ افق دریافت کیے جائیں۔

اسلامی جمہوریہ ایران کے محترم صدر کے افکار اس سلسلے میں دعوت فکر کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے قلمی آثار اس تفکر کے لیے صحیح خطوط اور علمی اساس فراہم کرتے ہیں۔ انہوں نے تہذیبوں کے درمیان مکالمے کی دعوت دے کر مستقبل کی تاریخ کے سامنے ایک نہایت اہم اور بنیادی سوال رکھ دیا ہے، اور وہ سوال یہ ہے کہ مستقبل میں انسانیت کی صلاح، فلاح اور ترقی اور عالمی سطح پر آزادی عدل اور امن کے قیام کا صحیح راستہ کیا ہے؟ تہذیبوں کے درمیان تصادم یا تفاہم! اس سوال پر تفکر اور تدبر ہر باشعور انسان پر انسانیت کے فرض کی حیثیت رکھتا ہے۔

☆☆☆

Marfat.com

تمدنوں کے مابین گفتگو ادیب ہی کرے

جاوید اقبال قزلباش☆

لوگ کہتے ہیں میں ایک ادیب ہوں، ہونگا، مجھے نہیں معلوم! صرف اتنا جانتا ہوں کہ میرا سینہ دردوں کا خزینہ ہے۔ جب بھی کبھی کوئی دلکش منظر، دلخراش واقعہ، دردناک سانحہ، یا احساسات کے تاروں کو چھیڑنے والا قصہ سنتا ہوں تو ہاتھ خود بخود قلم کی جانب بڑھتے ہیں۔ معلوم نہیں کیوں؟

قدرت نے مجھے ایک حساس اور نازک دل عطا کیا ہے، جو وجدان کی کھڑکیوں سے جھانک کر معاشرے کے مختلف مناظر کا بغور مشاہدہ کرتا ہے، پھر اس کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں اور یہ مجھے لکھنے پر اکساتا ہے۔ یہ مجھے اس بات کی تحریک کرتا ہے کہ میں کسی کیمرے کی طرح اس عکس کو اٹھا کر دوسروں تک منتقل کردوں، اس فرق کے ساتھ کہ کیمرہ تفسیر سے قاصر ہوتا ہے جبکہ میں اس کی گوناگوں تفسیریں، توضیحات اور تجزیے لکھ کر سماج کو اس پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہوں!

میرا دل بھی ایک عجیب مخلوق ہے۔ کائنات میں منفرد، اپنی مثال آپ۔ یہ حساس ہے، متحرک ہے اور انتہائی نازک ہے!

میرے دل کے جذبات و احساسات کا مشاہدہ کرنا ہو تو کسی برسات کی شام، کسی تاروں بھری رات، کسی خاموش بہتے جھرنے، ندی یا گہری شفاف جھیل کے کنارے اسے پالیں! اس وقت یہ کائنات کی عظمتوں اور پہنائیوں میں مستغرق ہو کر فکر کے عجیب موتی ڈھونڈ لاتا ہے۔ یہی موتی میں ذہن کے صدف میں رکھ لیتا ہوں اور ضرورت کے وقت زمانے کے جوہریوں کے سامنے ان کی نمائش کرتا ہوں۔ فکر کے یہ موتی میرا سرمایہ اور حاصل زیست ہیں۔ میں انہیں حادثات کی دست برد سے ہر ممکنہ طریقے سے محفوظ کیے رہتا ہوں تاکہ غم دوران کی چیرہ دستیاں ان موتیوں کی پر جلا سطحوں کو مکدر نہ کردیں۔ مگر کتنی ہی بار ایسا بھی ہوتا ہے کہ میں غم دوران کے جھمیلوں اور جھنجھٹوں سے انہیں بچا نہیں پاتا۔ پھر یہ گرد آلود ہو جاتے ہیں اور میں ایک خاص مدت تک کسی گوشے میں گم سم بیٹھا ان کی جلا اور

☆ شاعر، لکھاری، مترجم اسلام آباد

Marfat.com

تابندگی کو واپس لانے کی تدبیریں سوچتا رہتا ہوں۔ ان موتیوں کی تب و تاب غمِ دوران سے ماند پڑ جاتی ہے تو قلم سے تحریریں تراوش کرنا چھوڑ دیتی ہیں، نوشتے رک جاتے ہیں اور میں ایک معذور کی طرح ساکت و خاموش بیٹھا خلاؤں میں جھانکتا رہتا ہوں۔ بے بسی کی ایسی خاموشی ہے جس کے سوا کوئی چارہ نہ ہو!

ہاں، میں جو انسانیت کی بھوک، افلاس، فقر، بے چارگی، مرض اور گرفتاریوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا رہتا ہوں، یکا یک ساکت ہو جاتا ہوں۔ دل، ذہن، قلم سب کام چھوڑ دیتے ہیں۔ میرے اندر مسائل کی گتھیاں سلجھانے والا ادیب گویا سو جاتا ہے یا جیسے اسے مارفیا کا ٹیکہ لگا دیا گیا ہو۔ ایسے کئی دور آ جاتے ہیں اور آ کر گذر جاتے ہیں۔ پھر جیسے یکا یک ویرانے میں بہار کے دریچے کھل جاتے ہیں اور ذہن ایک انگڑائی لے کر جاگ اٹھتا ہے۔ طویل نیند کے بعد تھکا تھکا، اور خستہ خستہ سا! جاگنے کے بعد اس کی تمام تر توانائیاں پوری شدت سے عود کر آتی ہیں جیسے خزاں کے بعد گلشن ویران میں بہار آ جاتی ہے اور ہریالی، سبزہ اور پھولوں کی سوندھی سوندھی خوشبوؤں سے آمدِ بہار کا احساس ہو جاتا ہے۔ یہ خوشبوئیں ان تحریروں میں محسوس کی جا سکتی ہے جن کو قارئین اس طویل سرمائی سکوت کے بعد پڑھتے ہیں۔

تحریریں پھر جوبن پر آ جاتی ہیں۔ خوشبوئیں پھر پھیل جاتی ہیں۔ ادیب زندہ ہو جاتا ہے۔ ایک عارضی موت کے بعد! ہر ادیب کی زندگی میں ایسی موتیں آیا کرتی ہیں۔ جمود اور تعطل کے طویل دورانیے!

پھر قلم کی روانی ہے ادبی مضامین، فیچروں، مقالوں، افسانوں، نظموں، غزلوں کی صورت میں گلشنِ ادب میں طرح طرح کے پھول کھل اٹھتے ہیں۔

آج تک شاید ہی کوئی ادیب اس جمود کی کوئی درست توجیہ کر سکا ہو کہ یہ وقفے اور پرجمود دورانیے کیوں وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ شاید یہ نئی توانائی حاصل کرنے کے لیے ہوں، یا شاید مشاہدے اور فکر کے سوتے بھی لکھ لکھ کر خشک ہو جاتے ہوں اور لکھاری کو نئے مشاہدے ولولے اور نئی امنگ کی ضرورت پیش آتی ہو۔ مگر یہ دورانیے بہر حال ناگزیر طور پر آتے ہیں! اور جب قلم کی دنیا دوبارہ آباد ہوتی ہے تو تحریریں پہلے سے زیادہ نکھر جاتی ہیں۔ یہ دور ابتلاء و مسائل اور آزمائشاتِ انسانی کا دور ہے اور افسردگی اس کا ناگزیر تحفہ ہے۔ جتنا انسان کے اعصاب کا آج امتحان ہوا ہے کسی دور میں نہیں ہوا۔ اگر اس دور کو ڈیپریشن کا دور کہا جائے تو شاید غلط نہ ہو!

Marfat.com

یہاں تک کہ ڈاکٹر، طبیب، معالج خود ڈیپریشن دور کرنے کو مسکن دوائیں اور ٹرینکو یلائزرز استعمال کرتے ہیں۔ تو کیا واقعی انسان اس حد تک مبتلا ہو گیا ہے کہ اب اس کے پاس درد دل کا بجز اس کے کوئی چارہ نہیں رہا کہ وہ مسکن دواؤں اور خواب آور گولیوں میں ہی پناہ تلاش کرے!

اے انسانوں کے عظیم خدا! یہ انسانوں پر کیسا دور آ گیا کہ جس چیز کی ضرورت حیوانات بھی محسوس نہیں کرتے وہ انسان کے لیے ضروری ہو گئی ہیں۔ شاید معروضی حالات میں انسان کو چاہیے کہ وہ ایک ڈارک روم یا تاریک کمرے میں بیٹھ کر اپنی موجودہ حالت پر غور کرے، اپنی تاریخ کے مختلف ادوار کو سامنے رکھے اور اپنی صورتحال کا تجزیہ کرے کہ وہ کیا سے کیا ہو گیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ خودکشی کی راہ پر چل نکلا ہو؟

اس مرحلے میں ادب اور ثقافت سے جواب لیا جانا چاہیے۔ ہمیں سوچنا ہے کہ ہمارے اس دور میں ادب کے نام پر بے ادبی اور ثقافت کے نام پر کثافت اور بے حیائی کیوں پھیلائی جا رہی ہے؟ کیا شرف انسانی اور کمال آدمیت یہی ہے؟ کیا اسی مقصد کے لیے انسان کو اس کرۂ ارض پر خلیفہ خدا بنا کر بھیجا گیا تھا؟ سچے ادیب اپنی تحریروں میں اسی سوال کا جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ تجزیہ انسان کا ہے۔ حضرت انسان جو دنیا کی مشکل ترین کتاب ہے۔ اسے پڑھنا، سمجھنا، اور درک کرنا معمولی درجے کا کام نہیں ہیں۔ لہذا ادیب خاموش عکاس ہے۔ اور بے لاگ تجزیہ نگار۔

اسی لیے کہنا ہو گا کہ آج تک ادیبوں نے جتنی انسانیت کی خدمت کی ہے اگر اس کا حساب لگایا جائے تو انسان حیرت میں گم ہو جائے۔

پوری کی پوری ثقافتیں اپنے زندہ وجود کے لیے ادیبوں کی مرہون منت ہیں۔ ادیبوں کے زور قلم کا ہی نتیجہ، مختلف انقلابوں، تحولات اور اجتماعی تغیرات کی صورت میں مختلف تاریخی ادوار میں نظر آتا ہے۔ انسان کی بیداری، آگہی اور شعور کا معتدبہ حصہ انہیں کا عطا کردہ ہے۔ اسی لیے ادیب کل کا انسان ہوتا ہے۔ آج میری اس دنیا میں جہاں خلاق ادب کو ثانوی حیثیت دے دی گئی ہے اور مادی آسائشوں اور مال ومنال وثروت و مادیات کو فوقیت دی جا رہی ہے ادب اور ادیب کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے اگرچہ وہ مظلوم ہی سہی! مادی دوڑ نے آج کے انسان کو تباہی کے کنارے پہنچا دیا ہے۔ ادیب وہ جراح ہے جو خطرناک بیماری کا معالجہ کر کے انسانیت کے رستے زخموں پر مرہم رکھتا ہے۔

Marfat.com

چنانچہ ہر سچا ادیب انسانیت کا بے لوث خادم ہے۔ وہ اس کا معالج اور طبیب بھی ہے۔ مگر معاشرہ خودکشی کی راہ پر چل نکلنے کا فیصلہ کر لے تو ادیب کا سارا ادب دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے جیسا کہ مغرب میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے جہاں شیطانی آیات جیسی رسوائے زمانہ کتابوں پر انعامات دیے جاتے ہیں۔ یہ قلم کی آزادی اور بیبا کی کو گالی دینا ہے۔

ادیب تو انسان کا مددگار اور غمگسار ہوتا ہے۔ وہ کسی کا دل نہیں دکھاتا۔ کسی کی ثقافت' دین اور علمی آثار کا مذاق نہیں اڑاتا۔ مگر حیف صد حیف آج کی میری اس دنیا میں بعض ادیبوں نے قلم کو رقم کے عوض بیچ دیا ہے۔

انہوں نے فن' ہنر' اور نگارش کی تحقیر کر دی مگر انسانی ضمیر آج بھی زندہ ہے اور لاکھوں پابندیوں' طوق وسلاسل اور کتنی ہی بیڑیاں پہنائے جانے کے باوجود یہ زندہ ہی رہے گا۔ کیونکہ وجدان تو رحمان کا تحفہ ہے انسان کے لیے! اس لیے جن انسانوں کے اندر کا انسان زندہ ہوتا ہے وہ کسی ایسے ادب کی طرف ملتفت نہیں ہوتے جو ادب کے نام پر بے ادبی ہو۔ مگر چونکہ یہ لوگ اقلیت میں ہیں لہذا ادب اس مشکل دور میں اپنی ارتقائی منزلیں بصد دشواری طے کر رہا ہے۔ ادیب بھوکا رہ کر بھی ادب کی خدمت کرتا ہے اور انسانیت کی فلاح کو اپنی اولین ترجیحات میں شامل رکھتا ہے۔ اسی لیے تو میرے اندر کا ادیب بھی زندہ رہا۔ صدیوں کی طوالانی مسافت طے کر کے جو ادب ہم تک پہنچا ہے اسے زندہ رکھنے کے لیے زندہ ہے' بے ادبوں سے مقابلے کے لیے' ثقافت انسانی کے حقیقی خدوخال کو نکھارنے اور انسانی ضمیر کو جگانے اور جھنجوڑنے کے لیے زندہ ہے۔ یہ دور ٹیکنالوجی کا دور بھی کہلاتا ہے۔ اس میں گو کہ زمان ومکان کے فاصلے سمٹ گئے لیکن انسان انسانوں سے دور ہو گئے ہیں' دل ضمیر' روحیں' ٹیکنالوجی اور مشینوں کے بوجھ تلے دب گئی ہیں۔ انسانی روابط کے پل ٹوٹ چکے ہیں اور انسانوں کے درمیان خلیجیں اور عظیم خلائیں وجود میں آ گئی ہیں۔ نسلوں' قوموں اور رنگوں میں تفریق اور بعد کا احساس اجاگر ہو گیا ہے اور آج ھنٹنگٹن جیسے مغربی مفکر تمدنوں کے ٹکراؤ کا فلسفہ پیش کر رہے ہیں۔ جبکہ مشرقی اور اسلامی دنیا کی طرف سے جناب محمد خاتمی نے ''تمدنوں کی گفتگو'' کا فلسفہ پیش کر رہے ہیں اور ۲۰۰۱ء کو عالمی سطح پر گفتگو کا سال قرار دیا گیا ہے۔

انسانی تمدنوں کے اس برزخی دور میں انسان کی روح جنگوں' عالمی استحصال' بدامنی' منشیات اور دوسری تمام انسان خور عفریتوں کے روبرو کھڑی کانپ رہی ہے اور وہ ایک مسلسل

Marfat.com

کرب کی کیفیت سے دوچار ہے۔

چنانچہ آج ادیب کی ذمہ داریاں گذشتہ تمام انسانی ادوار سے بڑھ گئی ہیں۔ سچے ادیب کو ایک طرف تو انسان کو اس برزخی دور سے بسلامتی گذارنا ہے اور دوسری طرف اس کی تسلی و تشفی خاطر کے لیے قلمی انداز میں اس کے اندر جذباتی اور عواطفی ٹھہراؤ پیدا کرنا ہے تاکہ وہ اس عذابی کیفیت سے گذر کر کمال انسانی کی منزلوں کو پا سکے۔ میں جو آج کا ادیب ہوں مشینوں کی تہذیب سے مسلسل ٹکراتے ہوئے انسانوں کو کرچی کرچی ہونے سے بچانے کے لیے اپنے دفاعی منصب پر مصروف پیکار ہوں۔ میں اس کا سپاہی بھی ہوں اور مسیحا بھی۔ مجھے اس کے زخم دل کے لیے مرہم کا سامان بھی کرنا ہے' اسے اپنے دفاع کی ترغیب و حکمت عملی بھی سکھانی ہے اور جینے کا قرینہ سکھا کر سکون کا لمحہ بھی عطا کرنا ہے۔ گویا میں آج کے انسان کی پناہ گاہ ہوں آفات و بلیات دہر کے مقابل! میں نے زندہ ادب تخلیق کر کے انسانوں کو جینے کا حوصلہ دینا ہے۔ میری کتابوں اور میرے آثار نے فلم' ویڈیو' کمپیوٹر ہر چیز سے مقابلہ کر کے انسان کو مثبت وجدانی کیفیت کی طرف لے جانے کا فریضہ ادا کرنا ہے۔ انسان کو ہدف زندگی سے آشنا کرنا ہے۔ محبتوں کے گیت سنانے اور امن کے سند یسے دینے ہیں۔ اس کے تمام روحانی اور بدنی پھوڑوں اور کینسروں کی جراحت بھی کرنی ہے اور ان پر مرہم بھی رکھنا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ آج کا انسان بڑا دکھی اور مضطرب ہے۔ وہ کرچی کرچی ہو چکا ہے۔ وہ ہر آنے والی صبح کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھتا ہے اور جب صبح امید شام میں ڈھل جاتی ہے تو وہ مایوس نگاہوں سے زمانے کی دہلیز کی طرف دوبارہ شفق پر روشنی کی صورت میں نمودار ہونے والی نئی صبح کے انتظار میں کھو جاتا ہے۔ مگر ہر صبح فریب نظر کے سوا کچھ نہیں ہوتی اور ہر شام طلسم ہوشربا کی طرح اسے آفاق میں محو اور گم کر دیتی ہے۔ انسان غریب الوطن' ستایا ہوا اور بے چارہ ہی رہتا ہے۔ اسے بھی عالم بشریت کا انتظار ہے۔ میرے جلائے ہوئے چراغوں کی لو زمانے کی تمام آندھیوں اور طوفانوں سے نبرد آزما رہتی ہے۔ گویا میری ذات اسی لو کے اندر پروانے کی طرح جل رہی ہو اور شمع کی موم کی طرح گھل رہی ہو۔ ہاں میں ادیب ہوں میں گھل رہا ہوں۔ مگر انسان کو روشنی دینے کے لیے!! اسے صبح امید کا پیغام دینے کے لیے' کیوں کہ میری تخلیقات انسان میں جینے کا حوصلہ اور امنگ پیدا کرتی ہیں اور بقول ڈاکٹر اکرام اعظم (۱) (انسان کے) مستقبل کی واحد امید خلاقیت اور اس کے معنوی و روحانی پہلو میں ہے۔

☆☆☆

Reflections, Islamabad, 2001, p.25

Marfat.com

نذرِ اربعین حسینی

Marfat.com

انسان اور ابتلاء و عطا

پروفیسر ڈاکٹر شگفتہ موسوی ☆

سپاس بیکراں سزاوار ہے اس ملک القدوس عزیز الحکیم کے لیے جس نے اس کائنات کو انسان کے لیے خلق کیا پھر اسے زینت بخشی تا کہ اپنے بندوں کی آزمائش کر لے۔ اس آزمائش کی غرض و غایت مسلم و مجرم، مومن و کافر، مطیع و نافرمان کے درمیان حد فاصل برقرار رکھنا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کی صلاحیتوں، استعداد اور اعمال حسنہ کی بجا آوری کی بنا پر ان کو اپنی رحمتوں کا مستحق بنانا ہے۔ سورہ دھر میں خالق اکبر انسان کی خلقت ابتدائی کے ذکر کے بعد فرماتا ہے نبتلیہ فجعلناہ سمیعاً بصیراً ▪ انا ھدیناہ السبیل اما شاکرا و اما کفورا ہ

''تاکہ ہم اسے جانچیں تو اسے سنتا دیکھتا کر دیا۔ بے شک ہم نے اسے راہ بتائی یا حق مانتا یا ناشکری کرتا۔'' (۱)

اس آیت میں قابل غور نکتہ کلمہء ''نبتلیہ'' یعنی ''اس کی آزمائش ہے'' اور جب وہ رحیم و کریم اپنے بندے کی آزمائش کرتا ہے تو اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اُسے چشم و گوش و عقل و شعور بھی عطا فرماتا ہے اور اسے اختیار بھی عطا فرماتا ہے کہ اپنی فراست و کیاست کو استعمال کر کے کوئی ایک راہ اپنے لیے چن لے' راہ ہدایت یا گمراہی و ضلالت۔ گویا وہ ایک ایسے دوراہے پر کھڑا ہے جہاں دو راہیں موجود ہیں۔ ایک پستی اور دوسری صراط مستقیم کی طرف لے جانے والی اور وہ انہیں اختیار کرنے میں آزاد ہے۔ اگرچہ ہدایت کا راستہ وہ اپنے بندوں کو قرآن کے ذریعے واضح بھی کر رہا ہے جیسا کہ ارشاد ہوا انا ھدیناہ السبیل بے شک ہم نے اسے راہ بتلائی۔ اسی طرح ایک اور مقام پر یہ جانچنے کے لیے کہ کس کا عمل احسن ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

الذی خلق الموت والحیات لیبلوکم ایکم احسن عملاo (۲) ''وہ ذات وہ ہے کہ جس نے موت و حیات کو پیدا کیا تاکہ وہ تم کو آزمائے کہ تم میں سے کون سا انسان بلحاظ عمل سب سے بہتر ہے۔'' گویا ہدف حیات و ممات یعنی ہدف خلقت انسان ایک آزمائش ہی ہے۔ اگرچہ آفرینش

☆ سابق سربراہ شعبہ فارسی، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز۔ اسلام آباد

Marfat.com

کائنات و خلقت انسانی کے اہداف اور بھی ہیں۔ جیسا کہ قرآن میں ایک ہدف انس و جن کی خلقت کا اس کی پرستش و عبادت بھی ہے۔ ارشاد فرماتا ہے: وما خلقت الجن و الانس الا لیعبدون (۳) "اور میں نے جو بنائے ہیں جن اور آدمی سو اپنی بندگی کو۔" پس معلوم ہوا کہ ہدف آفرینش انسان کئی ہیں لیکن انسان کا وجود جو اکرم و اشرف ہے اور خداوند رحیم و کریم نے جب اس کائنات کو اس کے لیے ہی خلق کیا ہے جیسا کہ قرآن میں ہے ھوالذی خلق لکم مافی الارض جمیعاo "وہ خدا وہی ہے جس نے تمہارے واسطے وہ سب کچھ پیدا کیا جو زمین میں ہے" (۴) تو پھر وہ ذات جو الرحمٰن بھی ہے اور الرحیم (۵) بھی جیسا کہ فرماتا ہے والھکم الہ واحد لا الہ الا ھوالرحمن الرحیمo "اور تمہارا معبود ایک معبود ہے اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں مگر وہی بڑی رحمت والا مہربان۔" مگر پھر یہ سوال اٹھتا ہے کہ وہ انسان کا امتحان ابتلاء و بلا سے کیوں لیتا ہے؟ کیا خدانخواستہ اسے علم نہیں جو وہ اس کی آزمائش کر کے یہ جاننا چاہتا ہے کہ کس کا عمل احسن ہے؟ نہیں!! یہ سوچنا بھی کفر ہے!! بے شک خداوند رحیم و کریم اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے' وہ علیم و خبیر ہے اور اپنے بندوں کے احوال سے بے خبر نہیں۔ وہ تو ہمارے ضمیروں تک کی آواز بھی سنتا ہے۔ اس کا علم پوری کائنات پر محیط ہے۔ وہ زمانہ حال، آئندہ اور ماضی سے آگاہ ہے۔ زمان و مکان اس کے لیے اہمیت نہیں رکھتے۔ اس سے کوئی شے پوشیدہ نہیں۔ وہ تو فقط یہ چاہتا ہے کہ انسان اپنی صلاحیتوں کو پیش کر کے اس کی عطا کا حقدار بن جائے۔ وہ اشرف و اکرم اس لیے ہے کہ اس کے معبود نے اسے ہر آزمائش سے گذرنے کی صلاحیت و استعداد عطا کی ہے اور ان صلاحیتوں کے اجاگر کرنے کی غرض سے اسے تمام امکانات فراہم کیے گئے ہیں۔ یہ زمین و آسمان، شجر و حجر' مہ و پروین و قطب و سہا' یہ سب اس ہی کے لیے خلق کیے ہیں۔ ایک وسیع میدان اس کے قوائے مخفی کے امتحان کے لیے موجود ہے۔ اسے اپنی طاقتوں کا علم نہیں اور جو انہی امتحانات سے ہویدا ہو جاتی ہیں۔ شاگردوں کا امتحان کس لیے لیا جاتا ہے؟ تاکہ طالب علم کو اپنی استعداد سے آگاہی ہو۔ اگرچہ استاد خوب جانتا ہے کہ اس کی صلاحیت کا معیار کس درجہ پر ہے لیکن پھر بھی وہ امتحان لیتا ہے۔ کبھی اس غرض سے بھی کہ دوسروں پر اس کی شائستگی کا اظہار کر سکے۔ یا دیگر کمزور طالب علم اس کے دیئے ہوئے پیپر سے کچھ سیکھ سکیں۔ اسی طرح اللہ عزوجل کا بھی یہی ہدف ہے کہ وہ انسان کو جو اشرف ہے کائنات میں کامل ترین وجود کی حیثیت سے پیش کرے۔ یہ جہان تو انسان کے رشد و تکامل ہی کے لیے ہے۔ احسن عمل کی پاداش میں جو نعمت ملے وہی تو لائق ستائش ہے۔ اگر وہ بہشت میں پیدا ہوتا اور ہر نعمت

Marfat.com

با آسانی مل جاتی تو شاید وہ لذت معنوی سے آشنا نہ ہو سکتا۔ اس کی رحمت عالیہ کا حقدار وہ اپنی مرضی اور اپنے اختیار اور شائستگی عمل سے بن سکتا ہے۔ اپنے اختیار سے رضائے الہی کو خریدنا، ابتلاء کی منزل پر رضائے حق کے لیے اپنے کو پرکھنا، یہی تو رضائے الہیہ ہے! یہ انسان جس کی سرشت میں حیوانیت بھی ہے اور ملکوتیت بھی، اسے اختیار ہے کہ چاہے تو اپنے عمل نیک سے فرشتوں کو پیچھے چھوڑ کر سدرۃ المنتھیٰ تک پہنچ جائے اور چاہے تو جانوروں اور حشرات سے بھی پست کہلائے۔

انبیاء، اولیاء و ائمہ نے اپنے آپ کو سخت سے سخت امتحان کے لیے اس لیے پیش کیا کہ رب کی خوشنودی حاصل ہو اور یہی انسان کی سب سے بڑی سعادت ہے۔ انسان تو صاحب عقل و شعور ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ لذت، مسرت و انبساط فانی اشیا ہیں۔ ایثار و قربانی و فداکاری وہ بھی خالق اکبر کی مرضی کے مطابق، ایک دائمی سرور کی حامل ہوتی ہیں۔ اس کے معبود کی مرضی ہے کہ وہ انسان کو ابتلاء کی منزل پر دیکھے۔ اس نے پہلوں کو بھی آزمائش میں مبتلا کیا۔ حضرت آدمؑ کا امتحان اسماء (۶) سے لیا، حضرت ابراہیمؑ کی آزمائش کلمات سے اور بیٹے کی قربانی سے لی، یعقوبؑ کو یوسفؑ کے ہجر میں رلا کر امتحان لیا۔ یحییٰؑ کا سر فاسق و فاجر کے سامنے طشت میں لایا گیا۔ کیوں؟ تاکہ امتحان میں ثابت قدم رہنے والوں کو رب کی طرف سے اجر عظیم عطا ہو۔

ہر کہ درین بزم مقرب تر است
جام بلا بیشترش می دھند

پس قرآنی آیات و احادیث سے ثابت ہے کہ مالک حقیقی اپنے بندوں کا امتحان ضرور لیتا ہے۔ وہ بندگی کو ابتلاء و مصیبت کے ترازو میں تولتا ہے۔ لتبلون فی اموالکم و انفسکم۔ (۷) اہل علم جانتے ہیں کہ لسان عربی میں ''بلا'' کے معنی آزمائش یا امتحان کے ہیں اور جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے کہ مقصد و ہدف معبود حقیقی فقط اپنی مخلوق کو عطائے عظیم سے نوازنا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ سب سے سخت امتحان انبیاء، اوصیاء اور ائمہ کا لیا گیا ہے۔ حدیث شریف ہے۔ ان اشد الناس بلاء النبیون ثم الوصیون ثم الامثل فالامثل و انما یبتلی المؤمن علی قدر اعماله الحسنه فمن صح دینه و حسن عمله اشتد بلاؤه (۸) گویا تمام بنی نوع بشر میں، انبیاء سب سے زیادہ سخت مورد آزمائش قرار پاتے ہیں اور ان کے بعد اوصیاء، صاحبان فضل اور ان چنے ہوئے ابرار کا امتحان لیا جائیگا۔ جن کے اعمال زیادہ نیک اور حسنہ ہونگے ان کی اتنی ہی ابتلاء و آزمائش سخت ہوگی۔

Marfat.com

بلاشبہ چشم فلک نے کسی کا امتحان شاید اتنا سخت نہیں دیکھا ہوگا جتنا کہ سید الشہداء امام حسینؑ اور آل اطہار کا دشت نینوا و ارض کرب و بلا میں لیا گیا۔ حضرت اسماعیلؑ تو زیر تیغ رہ کر بھی بچ گئے بقول:

طغیان ناز بین کہ جگر گوشہ خلیل
آمد بہ زیر تیغ و شہیدش نمی کنند

گویا یہ شہادت عظمی اور ذبح عظیم کا لقب فرزند رسولؐ امام حسینؑ کی قسمت تھی:

تعالی اللہ کیا کیا اپنی قدرتیں دکھاتا ہے
کہ پتلے نور کے بنوا کے مٹی میں ملاتا ہے
کبھی حسینؑ کو کاندھے پہ حضرتؐ کے چڑھاتا ہے
کبھی سر ان کے نیزے پر چڑھا در در پھراتا ہے

بہر کیف مسلمان کو یہ بات کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نیک بندوں کا امتحان کبھی فقر و فاقہ اور کبھی تنگدستی سے لیتا ہے اور کبھی مقام و منزلت چھین کر، کبھی عزت و وقار دے کر اور کبھی بظاہر پستی و ذلت میں رکھ کر آزماتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ کبھی کبھی بندوں کا امتحان ثمر یعنی اولاد سے اور کبھی شدائد و مصائب کا سامنا کروا کے لیا جاتا ہے اور کبھی خوفناک امراض کی صورت میں بھی امتحان لیا جاتا ہے۔ اور یہ سب اس لیے کہ وہ ذات جواد، انہیں ان کے صبر پر اجر عظیم عطا کرے۔ کبھی کبھی اپنے بندوں کو اس طرح بھی تسلی دیتا ہے و لیبلی المومنین منہ بلاءً حسنا ''وہ اس لیے کہ اللہ مومنین کی اچھی طرح سے آزمائش کرے۔''(۹)

اگر چہ آیت مذکورہ کا تعلق مشہور آیت فلم تقتلوھم و لکن اللہ قتلھم و ما رمیت اذ رمیت و لکن اللہ رمی(۱۰) سے ہے یعنی تم نے انہیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے انہیں قتل کیا۔ وہ سنگریزے تم نے نہیں پھینکے تھے بلکہ اللہ نے پھینکے تھے۔ گویا مومنین کی آزمائش منت اور احسان پروردگار ہے جو کبھی نصرت ظاہری اور کبھی سری عطا، یعنی بصورت نعمت ابدی ہمراہ رہتی ہے اور خداوند عزوجل کبھی تو اپنے منتخب اور چنے ہوئے بندوں کے افعال تک کو اپنا فعل قرار دے دیتا ہے جیسا کہ آیت مذکورہ بالا سے ثابت ہے۔ گویا وہ ذات علیم و حکیم جب کبھی بھی امتحان لیتی ہے تو اس میں مصالح عظیم ضرور شامل ہوتے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ دنیا آزمائشگاہ ہے، دار الامن نہیں ہے نہ ہی بندوں کے ثواب و اجر دینے کی جگہ ہے حتی کہ کافروں کے لیے بھی یہ دنیا دار العقوبت نہیں ہے۔(۱۱) آخرت

Marfat.com

ہی وہ جگہ ہے جہاں کچھ افراد جہنم میں جھونکے جائینگے اور بعض افراد کا گھر جنت ہوگا۔ بقول فیض: کچھ اپنی سزا کو پہنچیں گے کچھ اپنی جزاء لے جائینگے۔

بہر کیف یہ دنیا ایک سرائے کی مانند ہے یا مزرع آخرت ہے! جو کچھ ہم بوئیں گے وہی کاٹیں گے بے شک یہ کائنات خلق ہی ''انسان'' کے لیے ہوئی ہے اس کی آزمائش کے لیے۔ اس کی غرض وغایت، انسان ہی ہے۔ یہ دنیا تو صرف مقدمہ ہے انسان کے لیے!! انسان خلق ہوا ہے امتحان کے لیے اور امتحان خداوندی ایک عطائے عظیم ہے اس کے بندوں کے لیے جو ایک دوراہے پر کھڑے ہیں۔ اب جو بھی چاہیں امتحان کی ابتلاء سے گذر کر کمال کی طرف جائیں اور مستحق عطا بن جائیں یا پھر گمراہی وضلالت کے گڑھے میں پڑے رہیں اور جانور سے بدتر کہلائیں۔ اب ان کا اپنا انتخاب ہے لیکن اس راہ کو انتخاب کرنے میں وہ رحیم وکریم اپنے انبیاء اولیاء واوصیاء کو بھیج کر اور سیدھی راہ دکھا کر حجت پوری کرتا ہے(۱۲) جو ''یتلو علیھم آیاتہ(۱۳)'' کے مصداق اس کی کتاب کو پڑھ پڑھ کر ان کے نفس کو پاک کرتے ہیں۔

امام جعفر صادق نے ابتلائے انسان کے ضمن میں فرمایا ہے: قال لابد للناس من ان یمحصو و یمیزو ویغیرتلووستخرج فی الغربال خلق کثیر (۱۴)'' یقیناً انسانوں کو تطہیر وتزکیہ کی غرض سے اس طرح پاک کیا جائیگا جس طرح چھلنی سے کوئی چیز صاف کی جائے۔'' پس جس کا ایمان جتنا کمزور ہوگا، اس کے اعمال حسنہ بھی اتنے ہی کم ہوں گے اور جس کا ایمان جتنا پختہ ہوگا اتنے ہی اعمال حسنہ زیادہ ہونگے اور اس کا امتحان بھی سخت ہوگا لیکن اجر بھی اتنا ہی عظیم ہوگا۔ حضرت علیؑ کا قول ہے: '' ومن سخف دینہ و ضعف عملہ قل بلاوہ و ان البلاء اسرع الی المؤمن التقی من المطر الی قرار الارض ''(۱۵)'' بے شک آزمائش اس طرح مؤمن پر سرعت کے ساتھ جھپٹتی ہے جس طرح سرعت سے بارش کا پانی اپنی قرار گاہ سے زمین پر گرتا ہے۔ جبکہ پانی کے گرنے کی سرعت اس بلاء کی سرعت سے کم تر ہوتی ہے۔'' پس مؤمن کا وجود امتحان وآزمائشوں کے لیے اس کی قرار گاہ ہے۔ جو کبھی اس سے دور نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء نے ہمیشہ خود کو اس ابتلاء اور آزمائش کے لیے تیار رکھا۔ اس لیے کہ وہ اس ابتلاء کی علت سے بخوبی آگاہ تھے۔ سردار دو جہاں، ختم المرسلین، محمد مصطفیٰ (ص) اور ان کی آل اطہار کی تو سرشت میں اطاعت خداوندی، جستجوئے رضائے معبود اور مصائب میں صبر وشکر بدرجہ اتم موجود تھے۔ سردار دو عالم جو محبوب سبحانی ہیں گل سرسبد آفرینش کائنات ہیں جن کے لیے یہ دنیا خلق ہوئی۔ حدیث قدسی: لولاک لما خلقت الافلاک

Marfat.com

''اے حبیب اگر تم نہ ہوتے تو میں یہ افلاک پیدا نہ کرتا۔ اس کی تفسیر یہی ہو سکتی ہے کہ یہ افلاک یہ دنیا ان کے امتحان کے لیے بنائی گئی تاکہ وہ ذات جو عادل ہے ان کو جزائے عظیم عطا فرمائے اور انہیں مقام محمود تک پہنچائے۔ لیکن ان کا امتحان، دیگر مصائب و شدائد کے علاوہ ان کی آل و اولاد سے لیا گیا۔ اور صاحبان اولاد بہتر جانتے ہیں کہ اولاد کو اذیت میں مبتلا دیکھنا سخت ترین امتحان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خاتم الانبیاء (ص) نے فرمایا: ما اوذی نبی مثل ما اوذیت ''کسی بھی نبی کو اتنی اذیت نہیں پہنچی'' جتنی اذیت مجھے پہنچائی گئی ہے۔'' یہ کیوں کہا آپ نے؟ اس لیے کہ آپؐ مقام محمود کے حامل ہیں۔ جتنا قرب الٰہی آپ کو حاصل ہے کسی اور نبی کو وہ قرب نہ مل سکا۔ ہر لحہ آپؐ مقام محمود کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں۔ اسی لیے آپ کا امتحان بھی اتنا ہی سخت لیا گیا تاکہ اجر عظیم، عظیم تر ہوتا جائے۔ ان عظیم الاجر لمع عظیم البلاء و ما احب الله قوما الا بتلاء هم ''اجر عظیم تو عظیم امتحان کے ساتھ ملحق ہے اور خداوند بزرگ اس قوم کو دوست نہیں رکھتا جو اپنے کو آزمائش کے لیے پیش نہ کر دے۔''(١٦)

یہ طویل مقدمہء'' بلا'' اس غرض سے صفحہ قرطاس پر لایا گیا ہے تاکہ وہ افراد جو کسی بھی بنا پر گرفتار بلا ہوں ان کی تسلی و تشفی ہو سکے کہ وہ اس طرح عطائے عظیم کے امیدوار بنتے جا رہے ہیں۔ بے شک نواسہ رسول جگر گوشہ بتول (س) امام حسین علیہ السلام اور ان کے رفقاء نے کربلا کے میدان میں شہید ہو کر یہ اجر عظیم حاصل کر لیا ہے اور اس طرح امام حسینؑ کی منزل منیّت بروز عاشورہ سمجھ میں آ گئی۔ ان کے فرزند علی ابن الحسین علیہ السلام کا منتہائے ظلم کے مقابل میں انتہائی صبر، تاریخ کے اوراق پر ثبت ہو گیا۔ اسیر سلاسل ہونے کے باوجود ان کی یہ دعا ہواؤں کے دوش پر سوار قیامت تک گوش انسانیت میں طنین انداز رہے گی۔

یا نعیمی و یا جنتی و یا دنیایی و آخرتی (١٧)''اے میرے معبود تو ہی تو میری نعمت عظیمہ ہے تو ہی تو میری جنت ہے اتو ہی میری دنیا ہے تو ہی میری آخرت ہے!''

پس جن ہستیوں کے لیے جزاوسزا' دنیا و آخرت ہیچ ہوں اور وہ فقط جویائے رضائے رب رہے ہوں انہی کا عشق یقیناً نقطہ کمال تک پہنچ چکا ہوتا ہے۔ وہی تو حامل مقام انسانیت ہیں۔ وہی اپنے جد کی طرح اسوہ حسنہ ہیں۔ تو کیا لوگ ان کے رب کی طرف سے عطا کیے ہوئے فضل سے حسد کریں گے؟ ''ام یحسدون الناس علیٰ ما اتٰھم الله من فضله'' ''پھر کیا یہ دوسروں سے اس لیے حسد کرتے ہیں کہ اللہ نے انہیں اپنے فضل سے نواز دیا۔''(١٨)

Marfat.com

شاعر مشرق اقبالؒ نے کیا خوب ان عظیم ہستیوں کے مقام کو اپنی معروف مثنوی رموز بے خودی میں بیان کیا ہے۔ وہ سر حادثہ کربلا اور حریت اسلامیہ (۱۹) کے مفہوم کو فارسی میں اس طرح بیان کرتے ہیں۔

ہر کہ پیمان با ھوالموجود بست
گردنش از بند ہر معبود رست

ہر وہ شخص جس نے اس ہستی سے جو ''ھوالموجود'' ہے عہد باندھ لیا اس کی گردن نے ہر (جھوٹے) معبود سے چھٹکارا پالیا۔

مومن از عشق است و عشق از مومن است
عشق را ناممکن ما ممکن است

مومن کی ذات عشق سے اور عشق مومن سے وابستہ ہے۔ عشق کے سامنے تو ہر ناممکن امر ممکن ہوتا ہے۔

عقل سفاک است و او سفاک تر
پاک تر، چالاک تر، بیباک تر

اگر عقل سفاک ہے تو وہ سفاک تر ہی نہیں بلکہ پاک تر، فعال تر اور نڈر بھی ہے۔

عقل در پیچاک اسباب و علل
عشق چوگان باز میدان عمل

عقل تو اپنے آپ کو اسباب و علل کی چون و چرا کی گتھیوں میں الجھائے ہوئے ہے۔ جبکہ عشق میدان عمل کا بہترین چوگان باز ہے۔

عشق صید از زور بازو افگند
عقل مکار است و دامی می زند

عشق اپنا شکار اپنے بازوؤں کے زور سے پچھاڑتا ہے اور عقل مکار ہے جو فریب کا فقط جال پھینکتی ہے۔

عقل را سرمایہ از بیم و شک است
عشق را عزم و یقین لاینفک است

عقل کا سرمایہ فقط شک اور خوف ہے اور عشق کے لیئے اس کا عزم اور اس کا یقین کبھی جدا نہ ہونے والا ہے۔

آن کند تعمیر تا ویران کند
این کند ویران کہ آبادان کند

Marfat.com

عقل اگر تعمیر بھی کرتی ہے تو ویران کرنے کے لیے جبکہ عشق ویران بھی کرتا ہے تو آباد کرنے کے لیے۔

عقل چون باد است ارزان در جہان
عشق کمیاب و بہای او گران

عقل تو ہوا کی طرح اس دنیا میں ارزاں ہے اور عشق اگرچہ کمیاب ہے لیکن اس کی ارزش و قیمت گراں ہے۔

عقل محکم از اساس چون و چند
عشق عریان از لباس چون و چند

عقل اپنے کو چون و چرا کی بنیاد پر محکم کرتی ہے اور عشق چون و چرا کے لباس سے مبرا ہے۔

عقل میگوید کہ خود را پیش کن
عشق گوید امتحان خویش کن

عقل کہتی ہے کہ اپنے آپ کو پیش کر کے جلوہ دے جبکہ عشق کہتا ہے کہ اپنا آپ امتحان لے۔

عقل با غیر آشنا از اکتساب
عشق از فضل است و با خود در حساب

عقل تو کسب و اکتساب کے ذریعے غیر سے آشنا ہوتی ہے اور عشق کا تعلق فضل سے ہے وہ اپنا حساب خود لیتا ہے۔

عقل گوید شاد شو آباد شو
عشق گوید بندہ شو آزاد شو

عقل کا نعرہ ہے کہ شاد رہو، آباد رہو، عشق کہتا ہے اپنے معبودؐ کا بندہ بن کر ہمیشہ کے لیے آزاد ہو جا۔

عشق را آرام جان حریت است
ناقہ اش را ساربان حریت است

عشق کے لیے اس کی آرام جان حریت و آزادی ہے۔ اس اونٹنی کا ساربان فقط حریت ہے۔

آن شنیدستی کہ ہنگام نبرد
عشق با عقل ہوس پرور چہ کرد

کیا تم نے وہ داستان سنی ہے کہ میدان جنگ میں عشق نے ہوس پرور عقل کے ساتھ کیا کیا؟

آن امام عاشقان پور بتولؑ
سرو آزادی ز بستان رسولؐ

Marfat.com

وہ عاشقوں کے رہبر امام، وہ جو فرزند بقول ہی نہیں بلکہ رسول پاکؐ کے چمن کے آزاد سرو ہیں۔

اللہ اللہ بائی بسم اللہ پدر
معنی ذبح عظیم آمد پسر

اللہ اللہ جن کے نسب کا یہ عالم کہ باپ بائے بسم اللہ کا لقب پانے والا اور وہ خود ذبح عظیم کی تفسیر۔

بہر آن شہزادہ خیر الامم
دوش ختم المرسلین نعم الجمل

وہ شہزادہ خیر الامم جس کی شان یہ کہ وہ سوار دوش ختم المرسلین ہو اور جس کے لیے سردار دو جہان کی پشت مبارک نعم الجمل (کتنا اچھا اونٹ) کہلائے۔

سرخ رو عشق غیور از خون او
شوخی این مصرعہ از مضمون او

ہاں اسی صاحب فضل کے خون سے عشق غیور سرخ رو ہو گیا اور اس مصرع کا حسن انہی کے مضمون (ذکر) ہی سے ہے۔

درمیان امت آن کیوان جناب
ھمچو حرف قل ھو اللہ در کتاب

اس امت کے درمیان اس زحل جیسی شان والے کی وہی حیثیت ہے جو قرآن میں حروف قل ھو اللہ کی۔

موسیٰ و فرعون و شبیرؑ و یزید
این دو قوت از حیات آمد پدید

سچ تو یہ ہے کہ موسیٰ و فرعون اور شبیرؑ و یزید حق و باطل کی وہ دو قوتیں ہیں جو حیات کی بدولت ہمیشہ ایک دوسرے سے نبرد آزما رہی ہیں۔

زندہ حق از قوت شبیری است
باطل آخر داغ حسرت میری است

حق تو زندہ ہی شبیری طاقت سے ہوتا ہے اور باطل کا انجام داغ حسرت لیکر مرنا ہی ہے۔

چون خلافت رشتہ از قرآن گسیخت
حریت را زھر اندر کام ریخت

ہاں سنو جب خلافت نے اپنا رشتہ قرآن سے توڑ لیا اور اس طرح حریت کے حلق

Marfat.com

میں زہر انڈیل دیا۔

خاست آن سر جلوہ خیر الامم
چون سحاب قبلہ باران در قدم

تو ایسے میں وہ خیر الامم' ملت بیضا کا بہترین جلوہ دینے والا سحاب قبلہ کی مانند اٹھا اور باران رحمت برساتا ہوا چلا گیا۔

بر زمین کربلا بارید و رفت
لالہ در ویرانہ ھا کارید و رفت

وہ سحاب قبلہ کربلا کی زمین پر برسا اور چلا گیا۔ اس طرح کہ ویرانوں میں سرخ پھولوں کی فصل کھڑی کر دی اور چلا گیا۔

تا قیامت قطع استبداد کرد
موج خون او چمن ایجاد کرد

اس نے قیامت تک جور و ظلم و استبداد کی جڑوں کو اکھیڑ پھینکا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کے خون کی موجوں سے حق کا چمن لہلہا اٹھا۔

بہر حق در خاک و خون غلطیدہ است
پس بنای لا الہ گردیدہ است

اس نے اثبات حق کے لیے خاک و خون میں لوٹ جانے سے بھی گریز نہ کیا' یہی وجہ ہے آج اسے لا الہ کی بنیاد کی حیثیت حاصل ہے۔

مدعایش سلطنت بودی اگر
خود نکردی باچنین سامان سفر

اگر اس کا مدعا سلطنت حاصل کرنا ہوتا' تو وہ ہرگز اس طرح کے مختصر ساز و سامان کے ساتھ سفر پر نہ نکلتا۔

دشمنان چون ریگ صحرا لاتعد
دوستان او بہ یزدان ھم عدد

ان کے مقابل دشمن تو صحرا کی ریت کی مانند ان گنت تھے اور ان کے رفقاء کی تعداد یزدان کے عدد کے برابر یعنی ۷۲ تھی۔

سر ابراہیم و اسماعیل بود
یعنی آن اجمال را تفصیل بود

وہی تو ابراہیم و اسمعیل کی داستان کا راز یعنی اس داستان مختصر کی تفسیر و تفصیل تھا۔

Marfat.com

عزم او چون کوھساران استوار
پائیدار و تند سیر و کامگار

اس کا عزم پہاڑوں کے سلسلوں کی مانند محکم، استوار، مضبوط اور کامیاب و سریع السیر تھا۔

تیغ بہر عزت دین است و بس
مقصد او حفظ آئین است و بس

شمشیر تو محض دین کی عزت کی خاطر ہوتی ہے اور بس، اور اس کا مقصد صرف آئین و شریعت محمدیہ کی حفاظت ہوتا ہے۔

ماسوا اللہ را مسلمان بندہ نیست
پیش فرعونی سرش افگندہ نیست

مسلمان اللہ کے سوا کسی کا بندہ نہیں۔ وہ کبھی کسی فرعون کے سامنے سر نہیں جھکاتا۔

خون او تفسیر این اسرار کرد
ملت خوابیدہ را بیدار کرد

اس کے خون نے ان رازوں کی تفسیر بیان کی ہے اور ملت خوابیدہ کو بیدار کر دیا۔

تیغ لا چون از میان بیرون کشید
از رگ ارباب باطل خون کشید

اپنی شمشیر کو جب اس نے نیام سے باہر نکالا تو گویا باطل کے جھوٹے خداؤں کی رگوں سے سارا خون نچوڑ لیا۔

نقش الا اللہ بر صحرا نوشت
سطر عنوان نجات ما نوشت

اس طرح اس نے "الا اللہ" کا نقش صحرا کی سطح پر لکھ کر ہماری نجات کے عنوان کی سطر لکھ ڈالی۔

رمز قرآن از حسین آموختیم
ز آتش او شعلہ ھا اندوختیم

حسین ہی سے ہم نے قرآن کی رمزیت کو پایا ہے۔ اسی کی آتش عشق سے ہم نے شعلوں کو ذخیرہ کیا ہے۔

تار ما از زخمہ اش لرزان ھنوز
تازہ از تکبیر او ایمان ھنوز

ہماری رگوں کے تار اس کے مضراب عشق سے ابھی تک لرزاں ہیں اور ان کی تکبیر سے ہمارے ایمان اب تک تازہ ہیں۔

Marfat.com

اے صبا اے پیک دور افتادگان
اشک ما بر خاک پاک او رسان

اے صبا! تو جو ہم دور افتادگان کی قاصد ہے ہمارے یہ آنسو اس کی پاک قبر پر لے جا کر نثار کر دے۔

یہی ہے وہ اجر اخروی اور عطائے عظیم جو امام حسینؑ اور آل عبا کو ملا۔ لیکن کبھی کبھی ذہن میں یہ سوال ضرور ابھرتا ہے کہ جو افراد اتنا عشق رکھتے ہوں اپنے رب سے، ان کا اتنا سخت امتحان کیوں لیا گیا، وہ جن کے لیے یہ زمین و آسمان پیدا کیے گئے۔ وہ تو فقط عبادت کی محراب میں سربسجود ہی اچھے لگتے! مالک حقیقی نے تو خود ہی کہا و ماخلقت الجن والانس الا لیعبدون نہیں پیدا کیا ہم نے جن وانس کو مگر عبادت کے لیے (۲۰) پھر اتنی سخت آزمائش کیوں؟ لیکن قرآن کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ کے نزدیک خلقت انسان و آفرینش کائنات کے مختلف اہداف ہیں جن میں سے کچھ درمیانہ اور کچھ عالی ہوتے ہیں۔ جس طرح یونیورسٹی کا معلم ایک عالی ہدف یعنی نوجوانوں کی تدریس کے غرض سے صبح سویرے اٹھتا ہے، لباس پہنتا ہے، اگر دوسرے شہر میں لیکچر دینے کے لیے بلوایا گیا ہو تو ہوائی جہاز کا ٹکٹ خریدتا ہے۔ اگر کوئی سوال کرے کہ یہ اتنی زحمتیں کیوں تو جواب یقیناً یہ ہوگا کہ مقصد درس و تدریس اور ابلاغ علم ہے۔ گویا یہ ابتدائی اہداف ہیں، ایک عالی مقصد کے حصول کے لیے۔ اسی طرح خداوند کریم کے افعال بھی بے غرض و بے مقصد نہیں ان میں بھی حکمت الٰہیہ پوشیدہ رہتی ہے۔ خود اس نے اپنی ذات کی معرفت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے ھو الذی خلق السموت و الارض فی ستۃ ایام و کان عرشہ علی المآء لیبلوکم ایکم احسن عملاً ''یعنی وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں کو چھ دن میں بنایا اور اس کا عرش پانی پر تھا کہ تمہیں آزمائے کہ تم میں کس کا کام اچھا ہے'' (۲۱) یہاں سبب و علت خلقت ارض و سماء، اس کی ربوبیت ہے اور ہدف و مقصد انسان کی آزمائش ہے۔

انسان کی خلقت پر تو سب سے پہلے فرشتوں نے اعتراض کیا تھا کہ یہ تو زمین پر فساد کریگا (۲۲) اور خون بہائے گا! لیکن اللہ کے مخلص بندوں کے جوہر ان پر عیاں نہ تھے کہ ان میں ایسے بھی ہونگے جن کے خون سے اسلام کا چمن تا ابد مہکتا رہے گا۔

بہر کیف انسان ایک دوراہے پر کھڑا ہے۔ اس کی اپنی مرضی ہے کہ ابتلاء کے مفہوم کو سمجھ کر اپنے آپ کو امتحان کے لیے پیش کر کے سند عالی حاصل کرے اور صراط مستقیم پر گامزن رہے یا پھر طاغوتی اثرات کے تحت گمراہی کی تاریکیوں میں کھو جائے۔ ہماری

Marfat.com

ہدایت کے لیے اس نے کچھ ایسی ہستیاں پیدا کی ہیں جن کے لیے کہا گیا ''اے خدا ہمیں ان کا سیدھا راستہ دکھا، جن پر تیری نعمتیں نازل ہوتی رہیں اور جو تیرے غضب سے دور رہے۔ فجعلناہ سمیعا بصیرا ○ انا ھدیناہ السبیل اما شاکراً و اما کفوراً ○ (۲۳)

من نکردم خلق تا سودی کنم
بلکہ تا بر بندگان جودی کنم

میں نے مخلوق کو اس لیے پیدا نہیں کیا کہ مجھے فائدہ ہو بلکہ اس لیے کہ ان بندگان پر جود و سخا کروں۔

منابع

۱- سورہ دھر: ۷۶: ۲ "کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن" از مولانا مفتی محمد احمد رضا خان، کراچی ۱۳۳۰ھ ص ۶۸۹۔
۲- سورہ ملک ۶۷: ایضاً صفحہ ۶۲۹
۳- سورۃ الذاریات ۵۱: ۵۶ "تفسیر شاہ عبد القادر" تاج کمپنی کراچی - لاہور، ص ۶۲۹
۴- سورہ بقرہ: ۲: ۲۹ ترجمہ و تفسیر محمد احمد رضا خان، ص ۵
۵- سورہ بقرہ ۲: ۱۶۳ ایضاً ص ۲۸
۶- سورہ بقرہ ۲: ۳۱، ایضاً ص ۹
۷- سورہ آل عمران ۳: ۱۸۶، ایضاً ص ۸۸
۸- چھل حدیث امام روح اللہ خمینی نقل از مجلہ التوحید (انگریزی) جلد ششم، شمارہ ۴، صفحہ ۵۱۔
۹- سورہ الانفال ۸: ۱۷، ترجمہ و تفسیر محمد احمد رضا خان، مکتبہ رضویہ کراچی صفحہ ۲۱۳
۱۰- سورہ الانفال ۸: ۱۷
۱۱- حدیث: وذالک ان اللہ لم یجعل الدنیا ثوابا لمومن ولا عقوبۃ لکافر. ملاحظہ ہو: *Al-Tawhid*, Vol VI, No 4, p.62
۱۲- رسلا مبشرین و منذرین لئلا یکون للناس علی اللہ حجۃ ترجمہ: ہم نے بھیجے بشارت دینے والے اور ڈرانے والے رسول تا کہ لوگوں کی کوئی حجت اللہ پر باقی نہ رہے۔ القرآن الکریم ۴: ۱۶۵، ترجمہ سید مجاور حسین رضوی، کراچی، ص ۱۶۵۔
۱۳- سورہ الجمعہ ۶۲: ۲
۱۴- *Al-Tawhid*, Vol VI, No 4, p.63
۱۵- ایضاً ص ۵۹۔
۱۶- ایضاً
۱۷- ایضاً

Marfat.com

۱۸- سورہ نساء ۴:۵۴ ترجمہ و تفسیر محمد احمد رضا خان، ص ۱۰۲
۱۹- اسرار و رموز اقبال، ص ۸-۱۲۵
۲۰- سورہ الذاریات ۵۱:۵۶
۲۱- سورہ ھود ۱۱:۷
۲۲- سورہ الانسان ۷۶:۲

☆☆☆

Marfat.com

کربلا... ایک تعارف

شوکت علی رضا

کرب و بلا مرکز امتحان و ابتلاء ہے۔ یہ ایک درس اطاعت و وفا ہے۔ اور ایک پیغام صدق و صفا ہے۔ یہ درسگاہ حریت فکر و عمل ہے۔ ایک کسوٹی رشد و جہل ہے۔ یہ بازگشت داستان ہابیل و قابیل ہے۔ اجمال سر ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کی تفصیل ہے۔ اور انبیاء و رسل کے رنج و محن کی تمثیل ہے۔ یہ ایک معیار سیادت ہے۔ منزل و مقصود شہادت ہے اور اوج و کمال عبادت ہے۔ کربلا معراج صبر و شکر اور میزان ایمان و کفر ہے۔ کربلا ایک طرف مشق جور و جفا ہے تو دوسری طرف مزرع تسلیم و رضا ہے۔ یہ ایک ایسا چراغ ہے جس میں جود و سخا کا تیل ہوتا ہے اور ایک ایسا میدان ہے جس میں قدر و قضا کا کھیل ہوتا ہے۔ کربلا مستضعفین جہان کے لیے کرن امید ہے اور مسافران شب ظلمت کے لیے صبح کی نوید ہے اور ہاں! کربلا حضرت زہراؑ کا موقف اور نبوت محمدؐ و توحید خدا پر دلالت ہے۔

ذرا سا توقف کر لیں۔ آنکھیں موند کر دریچہ ماضی میں سے جھانک کر دیکھیں، کیا دیکھا ہے آپ نے؟ پہچان نہیں سکے، ارے یہ بے آب و گیاہ، سنسان اور بنجر زمین منیٰ ہے۔ موت کے انتظار میں فرش زمین پر چت لیٹا ہوا یہ کمسن لڑکا اس عمر رسیدہ آدمی کا بیٹا ہے جس کے ہاتھ میں چھری ہے۔ یاد ہے نا، یہ دونوں باپ بیٹا ہی ہیں! اپنے دور کے سخی ترین اور بہادر ترین انسان۔ مصیبتوں کے کوہ گراں، تعصبات کی دہکتی آگ اور آزمائشوں کی منجنیقیں کوئی بھی چیز ان کے پایہ ہمت کو متزلزل نہیں کر سکی۔ مگر آج کیا ہوا! فضا کا رنگ بدلا بدلا سا ہے۔ بیٹا ہے کہ دست و پا رسن بوس ہیں اور باپ ہے کہ آنکھیں سایہ پوش، اور یہ آواز سن رہے ہیں آپ "ابراہیمؑ بس! بیٹے کے ہاتھ پاؤں اور اپنی آنکھیں بھی باندھ لیں۔ بیٹا تڑپے نہ اور باپ دیکھے نہ، بس! بس!! تم دیکھتے رہنا۔ بیٹے کے ہاتھ پاؤں کھلے ہونگے اور باپ کی آنکھوں پر پٹی بھی نہیں ہوگی۔

Marfat.com

پھر دیکھنا! ابراہیمؑ برچھی کیسے کھینچتا ہے۔"

اب ہمت ہے تو آنکھیں کھولیں۔ اور دیکھیں یہ منیٰ نہیں کربلا ہے۔ باپ اور بیٹا کسی سے اوجھل نہیں۔ ہزاروں بے رحم تماشائی ہیں۔ اور یہ دونوں اپنے افراد خانہ سے زیادہ دور بھی نہیں۔ چند قدم کے فاصلے پر آیت تطہیر کی مصداق مخدرات عصمت متحیر و متغیر اور انگشت بدندان کھڑی ہیں۔ بیٹا خاک و خون میں غلطیدہ اور باپ کمر خمیدہ ہے۔ بیٹے کے ہاتھ پاؤں بندھے ہیں نہ باپ کی آنکھیں۔ لاشوں کا بوجھ اٹھانے والے ضعیف حسینؑ کا ہاتھ ہے اور کڑیل جوان بیٹے کے سینے میں پیوستہ برچھی۔ اور ایک آواز یہاں بھی سنائی دے رہی ہے:

اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر	معنی ذبح عظیم آمد پسر
زندہ حق از قوت شبیری است	باطل آخر داغ حسرت میری است
بہر حق در خاک و خوں غلطیدہ است	پس بنائے لاالہ گردیدہ است
سر ابراہیمؑ و اسماعیلؑ بود	یعنی آن اجمال را تفصیل بود

یہ ہے کربلا جو دریائے فرات کے کنارے نازک اندام مخدرات عصمت اور معصوم بچوں کی "العطش" کی دلخراش صداؤں، سر بریدہ اور پامال شدہ بے گور و کفن لاشوں، جلے ہوئے خیموں کے پاس گھپ اندھیرے میں بیٹھے ہوئے لاوارثوں اور کوفہ کے بازاروں اور زندانوں سے ہوتی ہوئی چودہ سو میل دور شرابی کے دربار تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہ وہ کربلا ہے جہاں ابراہیم گھوڑے سے گرے تو چھ ماہ تک بیمار رہے اور شاہ مشرقین بھی یہاں آہ و بکا پر قابو نہ رکھ سکے۔ یہ حسینؑ کے نوجوان ضعیف بیٹے کا مقدر ہے کہ کربلا سے نکل کر چشم ہائے امامت سے لعل افشانی کرتے رہے۔

کربلا زمان و مکان کی قیود اور تخیل و امکان کی حدود سے بے نیاز ہے۔ یہ ازلیت و ابدیت سے سرفراز ہے۔ اس کا تذکرہ جگر سوز اور پیغام جاں گداز ہے۔ اس کا ہر کردار آفاقی ہے۔ جو تشنہ لب ہے مگر ساقی ہے۔ اس کی قلت ہر کثرت پر حاوی ہے۔ اور اس کا اختصار وسعت ارضی و سماوی ہے۔ اس کے پیرانہ سال کوہ عزم اور اس کے شیر خوار ذکی و فہیم ہیں۔ اس کے بے جان کائنات کی جان ہیں۔ جن کے دھوپ میں پڑے

Marfat.com

بے کفن لاشوں پر جنت کے سائے قربان ہیں۔ اس کے باسی کشتی عزم و ہمت کے ناخدا ہیں جن کی پیاس پر کوثر و تسنیم فدا ہیں۔

کربلا اک تسلسل ہے۔ اک جہد مسلسل ہے۔ یہ دین متین کی زندگانی ہے۔ یہ ہر نبی، ہر رسول کی کہانی ہے:

موسیٰؑ و فرعون و شبیرؑ و یزید
این دو قوت از حیات آید پدید

☆☆☆

Marfat.com

هر راز کہ اندر دل دانا باشد
باید کہ نہفتہ تر ز عنقا باشد
کاندر صدف از نہفتگی گردد دُر
آن قطرہ کہ راز دل دریا باشد
(عمر خیام)

Marfat.com

آئینہ ایران

Marfat.com

حضرت امام خمینی قدس اللہ سرہ کے یہاں جذبۂ عشق

ڈاکٹر انعام الحق کوثر[*]

چون بعشق آمدم از حوزۂ عرفان دیدم
آنچہ خواندیم و شنیدیم ہمہ باطل بود

ترجمہ: عشق سے مجھ پہ کھلا ذات کے عرفان کا راز
جو پڑھا اور سنا تھا سبھی باطل نکلا

حضرت امام خمینیؒ قرآن و حدیث اور فقہ میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ وہ اسلامی انقلاب ایران کے بانی اور عظیم رہبر تھے۔ وہ نامور خطیب، ادیب اور شاعر بھی تھے۔ آپ عارفوں اور سالکوں کے حلقہ کے سرخیل بھی متصور ہوتے ہیں۔ اپنے ایک عرفانی خط میں تحریر فرماتے ہیں:

وہ لوگ جو عارفوں کے مقامات اور اہل سلوک کی منزلوں کا انکار کرتے ہیں وہ خودخواہ اور خود پسند ہونے کی وجہ سے جس بات کو وہ نہیں جانتے اسے اپنی جہالت پر محمول نہیں کرتے بلکہ اس کا انکار کردیتے ہیں تاکہ ان کی خودخواہی اور خودبینی کو خدشہ لاحق نہ ہو۔

وہ خودخواہی اور خودبینی کا علاج یوں تجویز کرتے ہیں:

تمہارے نفس کا بت ہی تمہارے بتوں کی ماں ہے۔ جب تک اس بڑے بت اور زور آور شیطان کو درمیان سے نہ اٹھایا جائے گا اس بزرگ و برتر ذات کی جانب راستہ نہیں ملے گا۔ لیکن کیا ہوتا اگر یہ بت ٹوٹ جاتا اور اس شیطان پر قابو پا لیا جاتا۔ معصوم سے روایت ہے کہ میرا شیطان میرے ہاتھ پر ایمان لے آیا۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص کا چاہے وہ کتنا ہی ذی مرتبہ کیوں نہ ہو ایک شیطان ہوتا ہے اور اولیاء اللہ کو اس کو سدھارنے بلکہ اس کو مومن بنانے کی توفیق حاصل ہوجاتی ہے۔

اس عرفانی خط میں حضرت امام خمینیؒ اپنے ملتجائے مقصود کا یوں ذکر کرتے ہیں:

جن لوگوں نے اس (محبوب حقیقی) کو پالیا اور اس کے عشق میں کھو گئے ظاہر ہے کہ ان کا محرک اس کی ذات کے سوا اور کوئی نہیں۔ اسی محرک کے ساتھ ان کے تمام اعمال بھی الٰہیہ ہو جاتے ہیں۔ جنگ ہو کہ صلح، تیغ زنی ہو کہ نبرد آزمائی یا جو بھی تیرے خیال میں۔ خندق کے روز حضرت علیؑ کی ایک ضرب جن و انس کی عبادت سے افضل ٹھہری۔ اگر تحریک الٰہیہ نہ ہوتی تو اس سے خواہ کتنی بڑی فتح بھی کیوں نہ ہو جاتی اسے ذرہ بھر فضیلت نہ ملتی۔

---

[*] ۲۷۔۲۷ اے او بلاک ۔ ۳ سیٹلائٹ ٹاؤن کوئٹہ

Marfat.com

امام خمینیؒ کی مختلف حیثیتوں میں ایک قدر مشترک سچے' سچے اور پختہ عشق کی تھی جو ان کی ہر کامیابی کی تہ میں چھپا ہوا' جڑا ہوا اور دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اسی سے ان کا دل معمور اور روح سرشار تھی۔ اسی نے انہیں ایک تڑپ' ایک کرید اور ایک دلولے سے دوچار کر رکھا تھا۔ اسی تڑپ' دلولہ اور کرید کے باعث وہ ہمہ وقت بے تاب' بے چین اور بے قرار رہتے تھے۔ فرماتے ہیں:

دل کہ آشفتۂ روی تو نباشد دل نیست
آنکہ دیوانۂ خال تو نشد عاقل نیست
مستی عاشق دلباختہ از بادۂ تواست
بجز این مستیم از عمر دگر حاصل نیست
عشق روی تو دراین بادیہ افگند مرا
چہ توان کرد کہ این بادیہ را ساحل نیست

منظوم اردو ترجمہ:

دل ترے رخ کا جو شیدا نہیں؟ کیا دل ہوگا؟
جان نہ چھڑکے جو ترے خال پہ' عاقل ہوگا؟
تیرے عاشق کی یہ مستی ہے فقط مے سے تری
اس سے بڑھ کر بھی کوئی عمر کا حاصل ہوگا؟
جستجو نے تری اس دشت میں لا پھینکا ہے
کیا کریں اس کا کنارا ہے نہ ساحل ہوگا؟

امام خمینی عشق میں' عرفان میں اور وجدان میں سراپا ڈوب کر' گم ہو کر اور فنا ہو کر اپنے مشاہدات' تجربات' جذبات اور احساسات کو خوبصورتی' مہارت اور ہوشیاری سے اپنے غزلیہ کلام میں سمو دیتے ہیں۔ گویا ہوتے ہیں:

این ما و منی جملہ ز عقل است و عقال است
در خلوت مستان نہ منی هست و نہ مائی
آید آن روز کہ خاک سر کویش باشم
ترک جان کردہ و آشفتۂ رویش باشم
همچو پروانہ بسوزم بر شمعش ہمہ عمر
محو چون می زدہ در روی نکویش باشم
رسد آن روز کہ در محفل رندان سرمست
راز دار ہمہ اسرار مگویش باشم

Marfat.com

یوسفم گر نزند بر سر بالینم سر
ھمچو یعقوب دل آشفتہ پریش باشم

منظوم اردو ترجمہ:

یہ جھگڑے من و ما کے ہیں سب عقل کے شوشے
ہم مست الستوں میں کوئی من ہے نہ ما ہے
آئے وہ دن کہ میں خاک کوئے جاناں ہو جاؤں
نذر یوں جاں کروں دیوانہ رخ کہلاؤں
عمر بھر شمع کا پروانہ بنوں جلتا رہوں
مے رخ یار کی پی پی کے فروزاں ہو جاؤں
آئے وہ دن کہ سر محفل رندان سرمست
راز دل میں رہے یوں میرے صدف کہلاؤں
میرا یوسف مری بالیں سے گریزاں ہے اگر
مثل یعقوب سدا اس کی میں خوشبو پاؤں

عشق میں سوز ہے' گداز ہے' تب وتاب ہے' بے قراری' کسک' تپش اور لگن ہے' فطرت کا عطیہ ہے۔ آب وگل کا نچوڑ ہے۔ پرندوں کی اڑان ہے۔ چاند کی چاندنی اور سورج کی تابانی ہے۔ محجوب و مستور ہے۔ یہی ہے غزل کا وہ میکدہ جہاں کی ھاؤ ہو آپ کو غزل کے رگ و پے میں ملتی ہے۔ امام خمینیؒ کی دل گرفتہ اور دل گیر آواز آتی ہے:

این خرقہ ملوث و سجادۂ ریا
آیا شود کہ بر در میخانہ بردرم
بگذر از خویش اگر عاشق دلباختہ ای
کہ میان تو و او جز تو کسی حایل نیست
پیرم ولی بگوشہ چشمی جوان شوم
لطفی کہ از سراچہ آفاق بگذرم
دل دوریش بدست آر کہ از سرالست
پردۂ برداشتہ آگاہ ز تقدیرم کرد

Marfat.com

درد خواہم دوا نمی خواہم
غصہ خواہم نوا نمی خواہم
ہمہ آفاق روشن از رخ تواست
ظاہری جای پا نمی خواہم

الا یا ایہا الساقی زمی پرساز جامم را — کہ از جانم فرو ریزد ھوای ننگ و نامم را
بساغر ختم کردم این عدم اندر عدم نامہ — بہ پیر صومعہ برگو ببین حسن ختامم را

منظوم اردو ترجمہ:

سجادہ ہے ریا کا تو خرقہ فریب کا — پھاڑ آؤں جا کے میکدے اللہ وہ دن کرے
عشق صادق ہے تو پھر ذات کے پھندے سے نکل — تب نہ پیچ ان کے نہ تیرے کوئی حائل ہوگا
اس ناتوان کو تیری نگہ نے جواں کیا — احساس اک اور پہنچوں میں آفاق سے پرے
ایسے کسی درویش کا دل موہ جس نے راز الست کا پردہ — ہاتھ سے اپنے اٹھا کر مجھ کو صاف دکھا دی مری تقدیر
درد کی چاہ ہے، دوا کی نہیں — آرزو غم کی ہے نوا کی نہیں
تیرے رخ سے جہاں روشن ہے — حاجت اب تو کسی ضیا کی نہیں
مرے ساقی مرا ساغر مے گلرنگ سے بھر دے — جو میری جاں سے ننگ و نام کی خواہش فرو کر دے
چڑھا کر ساغر مے مُہر کر ڈالا پیام اپنا — مری حسن ختامی شیخ سے کوئی بیاں کر دے

☆☆☆

Marfat.com

پروفیسر سید محمود حسابی

قابلیتوں اور صلاحیتوں کا قابلِ رشک مرقع ☆

بنیاد پروفیسر سید محمود حسابی

مترجم توقیر حیدر

سید محمود حسابی ۱۲۸۱ ھ ش/ ۱۹۰۲ء میں تہران میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والدین ایک تفرشی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ زندگی کے ابتدائی چار سال تہران میں گزارنے کے بعد، آپ اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے ہمراہ شامات چلے گئے اور وطن سے دور بیروت میں آپ نے فرانسیسی پادریوں کے سکول میں اپنی ابتدائی تعلیم کا آغاز کیا۔ اس وقت آپ کی عمر سات برس تھی۔ اس رسمی تعلیم کے ساتھ ساتھ آپ کی فداکار، متدین اور فاضل والدہ محترمہ گوہر شاد حسابی نے آپ کو مذہبی تعلیم اور فارسی ادب کے زیور سے بھی آراستہ کیا۔ آپ نے قرآن کریم حفظ کر رکھا تھا اور اس پر غیر متزلزل ایمان رکھتے تھے۔ دیوان حافظ، گلستان و بوستان سعدی، شاہنامہ فردوسی، مثنوی مولوی اور منشآت قائم مقام جیسے اہم فارسی متون پر بھی آپ کو کامل عبور حاصل تھا۔

ابھی آپ مڈل سکول کے طالب علم تھے کہ پہلی جنگ عظیم چھڑ گئی جس کی وجہ سے بیروت میں موجود تمام فرانسیسی سکولوں کو بند کر دیا گیا۔ دو سال تک گھر ہی میں تعلیم کا سلسلہ جاری رہا اور پھر آپ امریکن کالج بیروت میں داخل ہو گئے۔ سترہ سال کی عمر میں بی اے (لٹریچر)، انیس سال کی عمر میں بی ایس سی (بیالوجی) اور پھر سول انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی۔ دوران تعلیم آپ عمارتوں اور سڑکوں کے نقشے بنا کر اپنے کنبے کی معاشی کفالت میں اہم کردار ادا کرتے رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ نے میڈیکل، ریاضی اور علم نجوم کے شعبہ جات میں بھی مہارت پیدا کی۔ آپ سڑکیں بنانے والی جس فرانسیسی کمپنی میں ملازم تھے، اس نے آپ کی لیاقت اور جانفشانی کے پیش نظر آپ کو اعلیٰ تعلیم کے لیے فرانس بھجوا دیا۔ آپ نے ۱۹۲۴ء میں انسٹی ٹیوٹ آف الیکٹریکل انجینئرنگ، پیرس میں داخلہ لیا اور ۱۹۲۵ء میں فارغ التحصیل ہوئے۔ ابھی

☆ روزنامہ ایران، ۲۲ اسفند ماہ ۱۳۷۹ ش

Marfat.com

ایام میں آپ نے فرانس کی برقی ریلوے کے شعبہ کان کنی (Mining) کی تعلیم کا آغاز کیا۔ Mining کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد آپ نے فرانس کے شمالی علاقے میں موجود لوہے اور صوبہ سار میں کوئلے کی کانوں سے اپنے کیریر کا آغاز کیا۔ لیکن علمی تشنگی پھر عود کر آئی۔ لہٰذا سوربورن یونیورسٹی میں فزکس کے شعبہ میں تعلیم و تحقیق کا آغاز کیا۔ آپ کی شب و روز کی کاوشیں رنگ لائیں اور یوں ۱۹۲۷ء میں آپ نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر لی۔ آپ نے اپنے تحقیقی مقالے "Sensitivity of Photoelectric Cell" میں اے ون گریڈ حاصل کیا۔ آپ نہ صرف ایران کی کلاسیکی شاعری اور موسیقی بلکہ مغرب کی کلاسیکی موسیقی کے فن سے بھی کافی آگہی رکھتے تھے۔ آپ نے کھیل کے میدان میں بھی نام پیدا کیا۔ خصوصاً پیراکی اور ڈوبتوں کو بچانے کے فن میں آپ بڑی مہارت رکھتے تھے۔

آپ نے ان گنت علمی و ثقافتی خدمات سرانجام دیں جن میں سے یہاں چند ایک کا تذکرہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا:

آپ نے منسٹری آف روڈز اینڈ ٹرانسپورٹ کی زیرِ نگرانی ۱۹۲۷ء میں ملک کے علمی، فنی اور تکنیکی نقشے تیار کیے جن میں خلیج فارس کے ساحل پر واقع مختلف ایرانی بندرگاہوں اور ان میں لنگہ و بوشہر سے ملانے والی شاہراہ کا نیا نقشہ بھی شامل تھا۔ وزارت راہ و ترابری کے زیرِ انتظام ۱۹۲۸ء میں آپ نے انسٹی ٹیوٹ آف انجینئرنگ کی بنیاد رکھی۔ اسی سال آپ نے ملک کا پہلا ریڈیو اسٹیشن قائم کیا۔ ۱۹۲۹ء میں آپ نے ٹیچرز ٹریننگ کالج قائم کیا اور وہاں تدریس کے فرائض سرانجام دینے لگے۔ ۱۹۳۱ء میں آپ کی کوشش سے ایران میں موسمیات کا پہلا اسٹیشن قائم ہوا۔ اسی سال آپ نے ایران کی پہلی ریڈیالوجی لیبارٹری قائم کی۔ ۱۹۳۲ء میں آپ نے ایران کا پہلا پرائیویٹ ہسپتال قائم کیا جس کا نام اپنی والدہ محترمہ گوہر شاد صاحبہ کے نام پر ''گوہر شاد ہسپتال'' رکھا۔ ۱۹۳۳ء میں آپ نے تہران یونیورسٹی کے قیام کی تجویز پیش کی اور اس کا چارٹر تیار کیا۔ ۱۹۳۳ء ہی میں آپ کی مساعی سے تہران یونیورسٹی میں فیکلٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کا قیام عمل میں آیا اور ۱۹۳۵ء تک آپ اس کے ڈین اور پروفیسر کے طور پر ذمہ داریاں نبھاتے رہے۔ ۱۹۴۱ء میں آپ نے تہران یونیورسٹی میں فیکلٹی آف بیسک سائنسز قائم کی اور تقریباً سات سال تک اس کے ڈین کی

Marfat.com

حیثیت سے بھی فرائض انجام دیے۔ ۱۹۵۱ء میں آپ کو دوبارہ ڈین فیکلٹی آف بیسک سائنسز کی ذمہ داریاں سونپی گئیں جہاں آپ عمر کے آخری ایام تک فزکس کے استاد کی حیثیت سے پڑھاتے رہے۔ آپ نے اس فیکلٹی میں Institute of Lenses: Vision and Applied Optics بھی قائم کیا۔

ڈاکٹر مصدق کی حکومت کے دوران آپ نے انگلش آئل کمپنی کو ایران سے بے دخل کرنے کی ذمہ داری نبھائی اور نیشنل آئل کمپنی ایران کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے پہلے چیئرمین اور مینجمنٹ ڈائریکٹر کی حیثیت سے فرائض سرانجام دیے۔ ۱۹۵۱ء میں آپ نے ڈاکٹر مصدق کی حکومت میں ثقافت اور تعلیم کی وزارت کا قلمدان سنبھالا۔ ۱۹۵۱ء میں ہی ایران کے قبائلی علاقوں میں مدارس کے قیام کا ایک منصوبہ شروع کیا جس کے تحت پہلے قبائلی سکول کا قیام آپ ہی کی کوششوں سے عمل میں آیا۔ اسی زمانے میں جب ایرانی پارلیمنٹ میں کنسورشیم اور Capitulation کی قرارداد پیش ہوئی اور ایران کی سنٹو میں شرکت کی تجویز زیر غور آئی تو آپ نے ان دونوں کی شدید مخالفت کی۔ ۱۹۵۱ء ہی میں آپ نے تہران یونیورسٹی میں انسٹی ٹیوٹ آف جیوفزکس قائم کیا۔ اسی سال تہران یونیورسٹی میں اٹامک ری ایکٹر ریسرچ سینٹر کا قیام عمل میں آیا۔ نیز ۱۹۵۱ء ہی میں اٹامک انرجی کمیشن قائم ہوا۔ ڈاکٹر حسابی تقریباً بیس سال تک انٹرنیشنل اٹامک کمیشن کے رکن رہے۔ ۱۹۵۶ء میں آپ کے زیر نگرانی ایران کی پہلی جدید رصدگاہ قائم ہوئی اور شیراز میں سیاروں پر تحقیق کا پہلا مرکز قائم ہوا۔ ۱۹۵۹ء میں صوبہ ہمدان کے شہر اسد آباد میں آپ کے زیر نگرانی ٹیلی فون ایکسچینج قائم ہوا۔ ۱۹۷۰ء میں ڈاکٹر حسابی نے انجمن موسیقی ایران قائم کی اور پھر اسی سال آپ نے فرہنگستان زبان ایران کی بنیاد رکھی اور تا حیات اس کے رکن رہے۔ ۱۹۸۱ء میں آپ نے ملک کا پہلا ایروناٹیکل ریسرچ سینٹر قائم کیا اور اس کے سربراہ کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ نیز بین الاقوامی ہوائی ادارے کے دائمی رکن مقرر ہوئے۔ دو نسلوں تک عملی طور پر مسلسل کام اور اساتذہ و طلباء کی سات نسلوں کی تعلیم و تربیت پروفیسر سید محمود حسابی کی گرانقدر خدمات کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ آپ کی انہی علمی خدمات کے اعتراف کے طور پر ۱۹۷۱ء میں آپ کو دانشگاہ تہران کے استاد ممتاز کے اعزاز سے نوازا گیا۔ سید محمود حسابی نہ صرف عربی، انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں کے ماہر تھے بلکہ سنسکرت،

Marfat.com

لاطینی ، یونانی ، پہلوی ، اوستایی ، ترکی اور اطالوی زبانوں میں بھی اچھی خاصی شد بد رکھتے تھے۔

ڈاکٹر حسابی کو اپنے وطن ، اپنی ثقافت اور ایرانی ادب اور دینی و مذہبی عقائد سے جنون کی حد تک عشق تھا۔ بہت سارے غیر ملکی سفروں کے ساتھ ساتھ آپ نے پورے ملک کے چپے چپے کی بھی خاک چھانی اور جہاں بھی گئے آپ نے اپنی یادوں کو سفرناموں کی صورت میں قلمبند کیا۔ سائنسی و علمی تحقیقات کے میدان میں ابھی تک آپ کے پچیس مقالے رسالے اور کتب منصۂ شہود پر آچکی ہیں۔ آپ کی پیش کردہ Theory of Infinity of Particles دنیا بھر کے سائنسدانوں اور فزکس دانوں میں مشہور ہے۔ فرانسیسی حکومت نے آپ کے دو بڑے علمی اعزازات ''اوفیسیہ دولالژیون دو نور'' اور ''کوماندور دولالژیون دونور'' سے نوازا۔ ڈاکٹر حسابی آئن سٹائن کے واحد ایرانی شاگرد تھے اور ان کی ساری زندگی دنیا کے بڑے بڑے سائنسدانوں مثلاً شرودینگر، بورن، فرمی، دیراک اور بوہر اور عظیم فلسفیوں اور ادیبوں مثلاً آندرہ ژید اور برٹرنیڈ رسل جیسے شہرہ آفاق افراد کے ساتھ ارتباط علمی مباحثوں اور تبادلہ خیال میں گذری۔ ۱۹۸۷ء میں ایران میں فزکس کی ساٹھ سالہ کانگرس کے موقع پر آپ کو ایران کے بابائے فزکس کے خطاب سے نوازا گیا' جبکہ ۱۹۹۰ء میں آپ کو سوسائٹی آف ورلڈ نالج / سائنسز کی جانب سے دنیا کی ممتاز ترین علمی شخصیت کے طور پر چنا گیا۔ آسمان علم و فن کا یہ درخشندہ ستارہ ۱۲ شہریور ۱۳۷۱ھ ش یعنی ۳ ستمبر ۱۹۹۲ء کو جنیوا یونیورسٹی کے ہسپتال میں (عارضہ قلب کی وجہ سے) غروب ہو گیا۔ لیکن اس سے پھوٹنے والی نور کی شعاعیں سدا جگمگاتی رہیں گی۔ ڈاکٹر حسابی کی وصیت کے مطابق ان کے جسد خاکی کو ان کے آبائی شہر تفرش میں سپرد خاک کیا گیا۔

☆☆☆☆

Marfat.com

اقبالیات

Marfat.com

اقبال ۔ ایک پیغام

ڈاکٹر سید محمد اکرم اکرام ☆

انیسویں اور بیسویں صدی کا دور مغرب کے استعماری حملوں کی بناء پر دنیائے اسلام کے لیے بڑے ابتلاء کا دور تھا۔ برصغیر کے مسلمانوں کے حالات بہت خطرناک اور ان کے مسائل نہایت پیچیدہ تھے۔ ہزار سالہ پرشکوہ دور حکومت کے بعد اب وہ جان بچانے کے لیے پناہ مانگ رہے تھے۔ ان کا قومی وجود ایک ڈوبتی ہوئی کشتی کی طرح تھا۔ وہ اپنی بقاء اور مستقل قومی زندگی سے اس حد تک مایوس ہو چکے تھے کہ اپنے احیاء کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے نیز استعماری مدبر سے بھی انہیں یہ سبق سکھا رہے تھے کہ قومیں افراد کی طرح ہوتی ہیں جب وہ مر جاتی ہیں تو دوبارہ زندہ نہیں ہوتیں۔ ان حالات میں انہوں نے یہ نظریہ قائم کر لیا تھا کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد وہ ہندوؤں کے غلام بن کر وقت گذار لیں گے۔ وہ بھول چکے تھے کہ ان کا ماضی کتنا تابناک تھا اور انہوں نے کس عزت وعظمت کے ساتھ زندگی بسر کی تھی۔

بیسویں صدی کا آغاز علامہ اقبال کے فکری ظہور کا زمانہ تھا۔ اقبال نے قانون اور فلسفے کے علاوہ تاریخ کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کی بیداری کے لیے ان کے گذشتہ شکوہ وجلال کو کبھی 'آتش رفتہ' کبھی 'نوائے رفتہ' اور کبھی 'سرور رفتہ' سے تعبیر کیا اور اس کی بازیابی کی تلقین کی۔ انہوں نے نوجوان مسلم کو خطاب کر کے کہا:

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوش محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاج سر دارا
تمدن آفریں، خلاق آئین جہانداری
وہ صحرائے عرب یعنی شتربانوں کا گہوارا(۱)

علامہ اقبال نے برصغیر کی تاریخ پر نظر دوڑائی تو یہ دیکھا کہ مسلمانوں کا ہزار سالہ قومی ورثہ

☆ صدر شعبہ اقبالیات پنجاب یونیورسٹی لاہور

Marfat.com

فارسی زبان میں محفوظ ہے۔ چنانچہ انہوں نے فارسی زبان کو وسیلہ ابلاغ بنایا تا کہ از خود رفتہ مسلمانوں کو اپنی اعلیٰ تہذیبی قدروں کا آئینہ دکھائیں۔ اقبال نے انگریزی اور عربی پڑھی تھی۔ فارسی سکول اور کالج میں نہیں پڑھی تھی لیکن انہوں نے اس زبان میں بھی غیر معمولی مہارت پیدا کر لی اور اپنے کلام کے تین شعری مجموعے اردو میں پیش کیے جبکہ چھ مجموعے فارسی زبان میں تحریر کیے۔ اپنے شعر کے ہر مصرعے کو اپنے خون کا قطرہ قرار دیا:

مصرعِ من قطرہ خونِ من است

ان کا فارسی کلام اتنا مؤثر ہے کہ ہر مصرعے نے قوت کے اعتبار سے ایک شمشیر کا کام کیا:

باغبان زور کلام آزمود
مصرعے کارید و شمشیرے درود (۲)

اقبال نے فارسی سیکھنے کے لیے انتہائی محنت کی اور بڑے بڑے فارسی گوشعراء کا کلام جن میں مندرجہ ذیل نام خاص طور پر نمایاں ہیں، بڑی دقت نظر سے پڑھا:

فردوسی، نظامی، ناصر خسرو، خاقانی، نظامی، انوری، مسعود سعد سلمان، سنائی، عطار، رومی، سعدی، عراقی، امیر خسرو، حافظ، جامی، فغانی، عرفی، نظیری، فیضی، طالب، کلیم، صائب، منیر، بیدل، قاآنی اور غالب وغیرہ۔

اقبال نے ان ممتاز شعراء کے بعض اشعار کو اپنے کلام میں تضمین کیا اور ان کی تعریف وتحسین بھی کی۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر ان کی توجہ رومی کی طرف غیر معمولی حد تک معطوف رہی۔ وہ فکر وفن میں اپنے آپ کو رومی کا خاص مرید سمجھتے تھے۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں:

پیر رومی خاک را اکسیر کرد
از غبارم جلوہ ھا تعمیر کرد (۳)

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر مرید اپنے پیر سے بے حد عقیدت ومحبت رکھتا ہے لیکن ایسا مرید شاید کم ہی ملے جو بلند پایہ فلسفی ہوتے ہوئے یہ کہے کہ وہ زندہ بھی اپنے پیر کے طفیل ہے۔ اقبال وہ دلباختہ مرید ہیں جو بیسویں صدی کی متشکک دنیا کو یہ بتاتے ہیں کہ وہ اپنے پیر مولانا رومی کے انفاس قدسی کے طفیل زندگی بسر کر رہے ہیں:

من کہ مستی ہا ز صہبایش کنم
زندگانی از نفسہایش کنم (۴)

مولانا رومی قرآن مجید کے بہترین مفسر ہیں۔ انہوں نے قرآنی اسرار ورموز کو ایسے

Marfat.com

دلنشین انداز اور دلپذیر پیرائے میں بیان کیا ہے کہ اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ چنانچہ رومی کی مثنوی کو اہل نظر نے نہ صرف قرآن کی تفسیر کہا ہے بلکہ اسے فارسی زبان میں قرآن کا نام بھی دیا ہے:

مثنوی　　مولوی　　معنوی

ہست　قرآن　در　زبان　پہلوی

علامہ اقبال بھی قرآن کو اسی نام سے یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں:

روئے　خود　بنمود　پیر　حق　سرشت

کو　بحرف　پہلوی　قرآن　نوشت　(۵)

رومی کی شناخت کے لیے ضروری ہے کہ انہیں ان کے زمانے کے حوالے سے دیکھا جائے۔ وہ اپنے زمانے کا شدید ردعمل ہیں۔ ان کا زمانہ عالم اسلام پر وحشی منگولوں کے حملے کا زمانہ تھا۔ چنگیز اور ہلاکو کی بے پناہ خون ریزی اور غارت گری نے مسلمانوں کی عزت وعظمت اور قوت وشوکت کا نام ونشان تک مٹادیا، بغداد برباد ہوگیا' ہر طرف خوف وہراس کی فضا چھا گئی' مایوسی اور ناامیدی نے زندگی کا اعتبار ختم کردیا۔ جو لوگ بچ گئے وہ خانقاہوں اور خراباتوں میں جا چھپے، فنا، توکل' تقدیر اور کسر نفسی اصول حیات بن گئے۔ اور قوت، استیلاء، جہاد اور سعی وعمل بے معنی الفاظ قرار پائے۔

ملت اسلامیہ کے نظام حیات کی تباہی کے خلاف رومی نے فرد اور ملت دونوں کے احیاء اور استحکام کے لیے قلم اٹھایا۔ انہوں نے کلام الٰہی اور تعلیمات نبویؐ کی تجلی سے مسلمانوں میں حرارت اور روشنی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اسی اعتبار سے علامہ اقبال نے مولانا رومی کو ایک عظیم مجاہد، مبارز، اور سخت کوش عارف اور مفکر کی حیثیت سے دیکھا۔ اور اسرار خودی کے مقدمہ میں رومی کا یہ روح پرور شعر لکھا:

زین همرهان سست عناصر دلم گرفت

شیر خدا و رستم دستانم آرزوست　(۶)

رومی اپنے انحطاط یافتہ معاشرے سے نہایت بیزار اور علی مرتضیٰؓ اور رستم دستان جیسے مجاہد اور شمشیر زن انسانوں کے آرزومند تھے۔ جہاد زندگی کے لیے دلیر' قوی اور سخت کوش اشخاص کو ضروری سمجھتے تھے۔ کاہلی' گوشہ نشینی' شکستہ نفسی' مجبوری' معذوری اور ناداری وغیرہ ان کے نزدیک منفی اصطلاحات تھیں۔

جس طرح ساتویں صدی ہجری میں عالم اسلام پر وحشی منگولوں نے تباہ کن حملہ کیا تھا

Marfat.com

اسی طرح چودھویں صدی ہجری میں مغرب کی وحشی اقوام نے دنیائے اسلام خصوصاً برصغیر پر خوفناک حملہ کیا۔ چنانچہ علامہ اقبال اپنے مرشد معنوی مولانا رومی کی طرح استعماری طاقتوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور دوسروں کو بھی اٹھنے کا پیغام دیا اور کہا:

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افق خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں (۷)

علامہ اقبال نے خودی یعنی خود شناسی اور خودداری کی تعلیم دی اور پھر ملی خودی کے حفظ وبقاء کے لیے سعی پیہم اور جہد مسلسل کو لازمی قرار دیا۔

انہوں نے زندگی کو عمل اور موت کو سکون اور سستی سے تعبیر کیا۔ قرآن مجید نے مجاہدین اسلام کو ''بنیان مرصوص'' یعنی سیسہ پلائی دیوار سے تعبیر کیا ہے۔ اقبال نے اس حوالے سے اپنے کلام کے بارے میں کہا:

فرنگی شیشہ گر کے فن سے پتھر ہو گئے پانی
مری اکسیر نے شیشے کو بخشی سختی خارا (۸)

چنانچہ اسرار خودی شیشے کو فولاد اور سنگ خارا کی طرح سخت اور شکست ناپذیر بنانے کی تعلیم پر مبنی کتاب ہے۔ علامہ اقبال لکھتے ہیں:

سنگ شوا ے همچو گل نازک بدن
تا شوی بنیاد دیوار چمن
در عمل پوشیده مضمون حیات
لذت تخلیق قانون حیات
خیز و خلاق جهان تازه شو
شعله در بر کن خلیل آوازه شو
با جهان نامساعد ساختن
هست درمیدان سپر انداختن
مرد خودداری که باشد پخته کار
با مزاج او بسازد روزگار
گر نسازد با مزاج او جهان

Marfat.com

می شود جنگ آزما با آسمان
برکند بنیاد موجودات را
می دھد ترکیب نو ذرات را
می کند از قوت خود آشکار
روزگار نو کہ باشد سازگار(۹)

اقبال ایک مشکل پسند اور جفا طلب مفکر ہیں۔ وہ شعلوں سے گل چینی کرتے ہیں اور آب شمشیر کو آب حیات سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک دشمن حقیقت میں دوست ہے جس کی وجہ سے انسان کی مخفی قوتیں اور صلاحیتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ اگر مخالف قوت نہ ہو تو انسان کسی طرح بھی ترقی نہ کر سکے۔ دنیا میں جو ہنگامہ برپا ہے وہ تنازع للبقاء ہی کا نتیجہ ہے۔ فرماتے ہیں:

راست می گویم عدو هم یار تست
هستی او رونق بازار تست
هر کہ دانای مقامات خودی است
فضل حق داند اگر دشمن قوی است
کشت انسان را عدو باشد سحاب
ممکناتش را برانگیزد ز خواب
سنگ رہ آب است اگر همت قوی ست
سیل را پست و بلند جادہ چیست(۱۰)

اقبال نے ان ولولہ انگیز اور روح پرور اشعار سے قوم کو جہاد زندگی کے لیے آمادہ کیا اور انہیں اپنی عظمت رفتہ اور دولت گمشدہ کی بازیابی کا حوصلہ دیا۔ انہوں نے ۱۹۳۰ء میں ہندوستان کے اندر مسلمانوں کی ایک آزاد مملکت کا نہ صرف تصور بلکہ مطالبہ پیش کیا تاکہ برصغیر میں بکھرے ہوئے کروڑوں مسلمانوں کی دینی وحدت برقرار رہے اور وہ اپنی اخلاقی، سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی قوتوں کو مجتمع کر کے ایک عظیم قوم کی حیثیت سے دوبارہ زندگی حاصل کر سکیں، اور ان کا عظیم تمدن جس کے نقوش گذشتہ ہزار سال میں برصغیر کے ہر حصے میں موجود ہیں دشمن کی اکثریت کے ہاتھوں ضائع نہ ہو جائے۔ اقبال نے ایک آزاد مسلم مملکت کے قیام کو نہ صرف لازمی قرار دیا بلکہ اپنے نور بصیرت سے یہ بھی کہہ دیا کہ ہندوستان کے شمال مغرب میں اس اسلامی مملکت کی تشکیل مسلمانوں کا مقدر بن چکی ہے۔ اقبال یہ سب کچھ

Marfat.com

برصغیر میں اسلامی تمدن کے تحفظ کے لیے کر رہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کو اپنے تمام کام میں بار بار ہدایت کی کہ وہ مغربی سیاست اور مغربی تمدن کو اپنانے سے گریز کریں۔ اقبال مغربی تہذیب و تمدن کو غیر اخلاقی اور غیر انسانی تصور کرتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ ایک بے جان تصویر ہے۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ اس کی کوئی بنیاد نہیں۔ یہ تمدن اپنی موت آپ مرنے والا ہے۔ اس کا ساز حیات شکستہ و بے نوا ہے۔ اس کا نغمہ ایک فریاد ہے اور بس:

بیا کہ ساز فرنگ از نوا در افتاد
درون سینہء او نغمہ نیست فریاد است
زمانہ کہنہ بتان را ہزار بار آراست
من از حرم نگذشتم کہ پختہ بنیاد است (۱۱)

علامہ اقبال نے مغرب کے فاسد تمدن کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ ان کی ایک اہم کتاب کا عنوان ہے ''ضرب کلیم یعنی اعلان جنگ دور حاضر کے خلاف'' یہ ایک ضرب کاری ہے جو انہوں نے مغربی تہذیب و تمدن پر لگائی ہے۔ پیام مشرق میں بھی جا بجا یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ مغرب نے عالم انسانیت کے مسائل نہ صرف حل نہیں کیے بلکہ انہیں مزید پیچیدہ اور مشکل بنا دیا ہے۔ انہوں نے حکیمان فرنگ کو پیغام دیتے ہوئے کہا:

از من اے باد صبا گوی بہ دانائے فرنگ
عقل تا بال گشود است گرفتار تر است
عجب آن نیست کہ اعجاز مسیحا داری
عجب این است کہ بیمار تو بیمار تر است
چشم جز رنگ گل و لالہ نبیند ورنہ
آنچہ در پردہ رنگ است پدیدار تر است (۱۲)

علامہ اقبال نے برصغیر میں مسلمانوں کے لیے ایک آزاد مملکت کے قیام کی جو تجویز پیش کی اور مغربی تمدن سے احتراز کی جو تلقین کی وہ اس لیے تھی کہ مسلمان اس مملکت میں شریعت محمدیہ کے مطابق زندگی بسر کریں۔ انہوں نے فرمایا کہ اگر آزادی سے مراد صرف یہ ہے کہ یہ خطہ جیسے پہلے دارالکفر تھا ویسے ہی رہے تو ایک مسلمان اس پر ہزار لعنت بھیجتا ہے۔

Marfat.com

اقبال کے نزدیک مسلمان کی زندگی اللہ تعالیٰ کے ایک سپاہی کی زندگی ہے' جس کا جینا اور مرنا رضائے الٰہی کے لیے ہے۔ لہٰذا اس کی حیات کی غایت الغایات یہ ہے کہ وہ روئے زمین پر اللہ تعالیٰ کی حکومت قائم کرے۔ انہوں نے اسرار خودی میں ایک جلی عنوان کے تحت قلمبند کیا کہ جہاد کا محرک اگر نفاذ اسلام نہ ہو اور محض جوع الارض ہو تو ایسا جہاد دین اسلام میں حرام ہے۔

علامہ اقبال کے فارسی' اردو اور انگریزی تمام کلام کی روح رواں صرف یہ بات ہے کہ تمام مسلمان اپنی عظمت رفتہ کی بازیابی کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور وہ مغربی سیاست کے قومیت اور وطنیت جیسے نظریات کی نفی کر کے مکمل طور پر متحد ہو جائیں اور ہر اس نظام کے اصنام کو پاش پاش کر دیں جو ان کے اعلیٰ نصب العین کی راہ میں حائل ہے۔

اقبال کے نزدیک مسلمان کا نصب العین روئے زمین پر حکومت الٰہیہ کا قیام ہے اور بس:

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتان آذری (۱۳)

برصغیر کے باہر عالم اسلام میں ایران اقبال کا پہلا مخاطب ملک تھا۔ ان کے افکار کا ایک اہم سرچشمہ ایران ہی سے پھوٹا تھا۔ ان کا مرشد معنوی وہیں کا بے مثال عارف تھا۔ ان کی الہامی زبان اسی ملک کی زبان تھی۔ چنانچہ انہوں نے اپنے کلام کے جاودانی آثار فارسی زبان ہی میں پیش کیے اور کہا کہ یہ اشعار مجھ پر فارسی زبان ہی میں وارد ہوتے ہیں۔ اسرار خودی' رموز بیخودی' پیام مشرق' زبور عجم' جاوید نامہ' پس چہ باید کرد اے اقوام شرق مع مثنوی مسافر اور ارمغان حجاز ان کی ایران دوستی کی بہترین مثال ہیں۔ وہ کشمیری نژاد تھے' دل ان کا حجاز مقدس سے تھا اور زبان شیراز سے تھی:

تنم گلے ز خیابان جنت کشمیر
دل از حریم حجاز و نوا ز شیراز است (۱۴)

علامہ اقبال کا انقلاب انگیز پیغام جب تشکیل پاکستان کے بعد ایران پہنچا تو وہاں بھی برصغیر کی طرح ذہنوں میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اقبال کا اسلامی پیغام شاہنشاہی نظام کے خلاف ایک ضرب کاری تھا۔ انہوں نے یہ پیش گوئی بھی کی تھی کہ عنقریب ایک مرد مجاہد ظہور میں آئے گا جو غلامی کی زنجیروں کو توڑ دے گا:

Marfat.com

می رسد مردے کہ زنجیر غلاماں بشکند
دیدہ ام از روزن دیوار زندان شما (۱۵)

علامہ اقبال نے شاہنشاہی نظام کے خاتمے اور ملت ایران کے استقلال کو بھی ان لفظوں میں پیش کیا ہے:

امم را از شہان پایندہ تر دان
نمی بینی کہ ایران ماند و جم رفت (۱۶)

علامہ اقبال کے حقیقت پسندانہ نظریات کی بناء پر انہیں مشرق و مغرب میں خراج تحسین ادا کیا گیا۔ ایران سے متعدد شاعروں، دانشوروں اور عالموں نے ان کے فکر و نظر کی تعریف کی اور ان کی فارسی سے محبت کی تحسین کی، لیکن جن محبت آمیز الفاظ میں رہبر معظم جمہوری اسلامی ایران جناب سید علی خامنہ ای نے علامہ اقبال کی تعریف کی، وہ ان کے انتہائی مخلصانہ جذبات کا اظہار ہے۔ وہ خود ایک عظیم اقبال شناس ہیں۔ انہوں نے اقبال کو مشرق کے تاریک افق پر طلوع ہوتے ہوئے ایک روشن ستارے کی طرح دیکھا اور اقبال کو ''ستارۂ بلند اقبال مشرق'' کے خوبصورت نام سے یاد فرمایا۔ اس مقالے کے حسن ختام کے طور پر ان کے بعض بیانات درج کیے جاتے ہیں تاکہ مقام اقبال کی مزید وضاحت ہو سکے، فرماتے ہیں:

میں اپنے بہن بھائیوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ مجھے اجازت دیں کہ میں یہاں مخلصانہ طور پر اس شخص کی حیثیت سے گفتگو کروں جو سالہا سال سے اقبال کا مرید رہا ہے اور جس نے اپنے ذہن میں اقبال کے ساتھ زندگی گذاری ہے تاکہ میں ان کے عظیم احسان اور اپنے عزیز لوگوں کے ذہن پر ان کے اثرات کے عظیم حق کو کسی حد تک ادا کرسکوں۔ (۱۷)

اقبال کا فارسی کلام میرے نزدیک معجزات شعر میں سے ہے۔ ہمارے ادب کی تاریخ میں فارسی میں شعر کہنے والے غیر ایرانی بہت زیادہ ہیں لیکن کوئی ایک بھی ایسا نہیں جو فارسی شاعری میں اقبال کی خصوصیات کا حامل ہو۔

اگرچہ اقبال فارسی ماحول میں نہیں رہے تھے اور فارسی کی پرورش گاہ میں انہوں نے کبھی زندگی نہیں گذاری تھی اور فارسی بولنے والوں سے بھی ان کی مصاحبت نہیں تھی، اس کے باوجود انہوں نے لطیف ترین، دقیق ترین اور نایاب ترین مضامین کو اپنی طویل اور بعض نہایت اعلیٰ نظموں کے سانچے میں ڈھال کر پیش کیا ہے اور یہ چیز میری رائے میں اعلیٰ شعری استعداد اور صلاحیت کا نتیجہ ہے۔

اقبال نے بعض مضامین کو ایک شعر میں بیان کردیا ہے۔ اگر انسان چاہے کہ اسے نثر میں بیان

Marfat.com

کرے تو نہیں کرسکتا۔ ایک شعر کو جسے انہوں نے آسانی کے ساتھ بیان کر دیا ہے، اگر ہم فارسی نثر میں جو ہماری اپنی زبان ہے بیان کرنا چاہیں تو ایک مدت تک ہمیں زحمت اٹھانی پڑے گی۔ دراصل اقبال ایک عظیم شاعر ہیں اور ان کے بعض فارسی اشعار کمال عروج پر پہنچے ہوئے ہیں۔ (۱۸)

مآخذ

۱- بانگِ درا، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۱۹۸
۲- اسرار و رموز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۵
۳- ایضاً، ص ۹
۴- ایضاً،
۵- ایضاً،
۶- ایضاً، ص ۴
۷- ایضاً، ص ۱۴۰
۸- بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال (اردو)، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۳۶۲
۹- اسرار و رموز، ص ۴۹-۴۸
۱۰- ایضاً، ص ۵۳
۱۱- مثنوی مسافر، کلیاتِ اقبال (فارسی)، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۷۳۵
۱۲- پیامِ مشرق، ص ۲۲۵
۱۳- بانگِ درا، ص ۲۹۶
۱۴- پیامِ مشرق، ص ۲۱۴
۱۵- زبورِ عجم، کلیاتِ اقبال (فارسی)، ص ۵۱۷
۱۶- پیامِ مشرق، ص ۷۸
۱۷- اقبال ستارۂ بلند اقبال مشرق، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۵
۱۸- ایضاً، ص ۹

☆☆☆

Marfat.com

آن به که دریں زمانه کم گیری دوست
به اہل زمانه صحبت از دور نکوست
آن کس که به جملگی ترا تکیه برا وست
چو چشم خرد باز کنی دشمنت اوست
(عمر خیام)

Marfat.com

شخصیات

Marfat.com

مغلیہ عہد میں اٹک کے اہل فضل و کمال

راجہ نور محمد نظامی☆

راولپنڈی سے جی ٹی روڈ پر پشاور کی طرف جاتے ہوئے اٹھاون میل کے فاصلے پر دریائے سندھ کے کنارے ایک پہاڑ کے دامن میں اٹک کا قدیم اور مشہور شہر واقع ہے جو کئی بار برباد اور آباد ہو چکا ہے۔

برطانوی دور کے مشہور ماہر آثار قدیمہ سر الیگزنڈر کننگھم کی تحقیق کے مطابق یہ شہر قبل از مسیح کے ٹکا نامی ایک مشہور قبیلہ کا آباد کردہ ہے جو اس علاقے پر حکمران تھا[1] جبکہ مشہور محقق و مورخ قاضی عبدالحلیم اثر افغانی کی تحقیق یہ ہے کہ مشہور صحابی حضرت مہلب بن ابی صفرہ العتکی اردیؒ نے ۵۰ھ/۶۸۰ء میں وادی چھچھ کو فتح کرنے کے بعد اپنے نام سے ایک قلعہ العتک تعمیر کروایا جس کا نام بہ مرور ایام پہلے اتک اور پھر اٹک ہو گیا۔[2]

۹۹۱ھ/۱۵۸۱ء میں مغل بادشاہ جلال الدین محمد اکبر نے بیرونی حملوں کی روک تھام کی غرض سے اس مقام پر ایک قلعہ تعمیر کروایا جس کا نام کتب تواریخ میں اٹک بنارس بتایا گیا ہے۔[3] اس قلعہ کے دو حصے تھے۔ اوپر والا حصہ فوجوں کا مستقر تھا جبکہ نیچے والے حصہ میں شہر اور بازار تھا۔ قلعہ کے باہر بھی بہت بڑی آبادی تھی۔ مغلیہ دور میں اٹک بہت آباد اور پر رونق شہر تھا' جس میں دیگر لوگوں کے ساتھ علمائے کرام اور صوفیائے عظام بھی موجود تھے جن میں سے بعض صاحب تصانیف بھی تھے۔ دست برد زمانہ کے ہاتھوں سے بچ کر ان علماء کی بعض تصانیف آج بھی کچھ کتب خانوں میں موجود ہیں۔ ان میں سے بعض علماء اور ان کی تصانیف کا تعارف پیش خدمت ہے۔

ا۔ حضرت مولوی محمد یوسف اٹکی

حضرت مولوی شیخ محمد یوسف بن شیخ رحمت اللہ اٹک کے رہنے والے تھے۔[4] آپ کے والد حضرت شیخ رحمت اللہ المعروف شیخ تلا اپنے وقت کے ایک روحانی بزرگ اور صاحب تصانیف عالم تھے۔[5] مولوی شیخ محمد یوسف نے ایسے علمی اور روحانی ماحول میں پرورش پائی۔

☆ بھوئی گاڑ، براستہ فاروقیہ ہزارہ، ضلع اٹک ۔ ۴۳۶۲۱

Marfat.com

ان کا نام ان کی تصنیف منتخب التواریخ کی وجہ سے آج بھی زندہ ہے۔

منتخب التواریخ (۶)

یہ کتاب ایک مقدمہ، پانچ اقسام، ابواب وفصول اور خاتمے پر مشتمل ہے۔ اس میں تخلیق کائنات سے لے کر ۱۰۳۷ھ/ ۱۶۲۸ء جلوس شاہجہانی تک کے احوال وکوائف لکھے ہوئے ہیں۔ اس کے مندرجات میں تخلیق کائنات، انبیاء ورسل، اولیاء وحکماء، تاریخ عالم، شاہان قدیم روم وایران، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وخلفاء راشدین، دنیائے اسلام کے خلفاء وحکمران، چین وتاتار کے بادشاہ، شاہان ہندوسند، علماء، اولیاء، شعراء، ائمہ، مجتہدین اور خواتین عرفاء بھی شامل ہیں۔

خاتمہ تین ابواب پر مشتمل ہے اور اس میں ہفت اقلیم شہر، ملک، پہاڑ، صحرا، سمندر، دریا، چشمے، کنویں، نوادر وعجائبات قدرت کا ذکر شامل ہے۔

منتخب التواریخ کتاب کا اصل نام ہے اور مولوی شیخ محمد یوسف اٹکی کے دوست میر محمد بیگ بن میرزا بیگ نے ''منتخب بی بدل'' سے بطور تعمیہ اس کی تاریخ تکمیل نکالی۔ منتخب یعنی ۱۰۹۲ منفی بدل یعنی ۳۶ = ۱۰۵۶ھ (=۱۶۴۶ء) کتاب کے مشمولات پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے مختلف کتب تواریخ سے استفادہ کیا ہے۔ کتاب کی افادیت کے پیش نظر اس کا خلاصہ '' انتخاب منتخب التواریخ'' کے نام سے منشی عبدالشکور بن عبدالواسع ٹھٹھوی نے ۱۰۸۴ھ/۱۶۷۳ء میں مرتب کیا تھا۔

منتخب التواریخ کے خطی نسخے درج ذیل کتب خانوں میں موجود ہیں:

☆ لائبریری برٹش میوزیم لندن، جس کی فوٹو کاپی شاکر القادری ساکن اٹک شہر کے پاس موجود ہے۔

☆ کتب خانہ دانشگاہ پنجاب، لاہور، نمبر ۶۸/۷ پی ای آئی/ ۳۹۔

☆ کتب خانہ گنج بخش، مرکز تحقیقات فارسی ایران وپاکستان، اسلام آباد، شمارہ ۱۲۶۰۳۔

☆ کتب خانہ نوشاہیہ، ۶۹ - ماڈل ٹاؤن ہمک، اسلام آباد۔

☆ کتب خانہ مولانا مفتی محمد رفیق، مدرسہ علوم المرتضی رضی اللہ عنہ سرگودھا۔ (۷)

۲- حضرت مولانا خواجہ محمد زاہد اٹکی

حضرت مولانا خواجہ محمد زاہد بن خواجہ عزیز اللہ بن خواجہ محمد عارف اٹک میں پیدا

Marfat.com

ہوئے۔ آپ حضرت شیخ الاسلام خواجہ نجم الدین کبریٰ کی اولاد سے تھے۔ آپ کے اجداد ایران سے بخارا اور وہاں سے دیہہ خرسانی دامن کوہ سلطان افغانستان میں آ کر آباد ہوئے۔ جہاں سے آپ کے والد حضرت خواجہ عزیز اللہ حسن ابدال آ کر اورنگ زیب عالمگیر کی فوج میں ملازم ہوئے اور اٹک میں آباد ہو گئے۔

حضرت خواجہ محمد زاہد اٹکی سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ میں حضرت سرّ الاعظم شیخ محمد یحییٰ المعروف حضرت جی اٹک کے فیض یافتہ اور مرید تھے لیکن ان کی وفات کے بعد آپ نے ان کے خلیفہ و جانشین حضرت مولانا حافظ محمد معصوم شاہ پیر سباکی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کی۔

آپ نے دو فرزندوں (۸) کے علاوہ ایک کتاب قصۃ المشائخ کے نام سے یادگار چھوڑی جس میں آپ کے بزرگوں کی منظوم مناقب، قطعات اور شجرہ منظومہ بھی شامل ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔

آپ کی تصنیف کا تاریخی نام قصۃ المشائخ ہے۔ جس سے سال تصنیف ۱۱۴۶ھ (۱۷۳۳ء) برآمد ہوتا ہے۔ اس کتاب میں شروع سے لے کر نصف تک سرچشمہ اعلیٰ سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ سے لے کر حضرت سرّ الاعظم شیخ محمد یحییٰ المعروف حضرت جی اٹک (۹) تک کی اس لڑی کے تمام بزرگوں کے حالات مختصراً بیان ہوئے ہیں۔ اس کے بعد حضرت مولانا حافظ سید محمد معصوم پیر سباکی کا مفصل تذکرہ ان کے خاندان کی بخارا سے ہجرت اور مراحل ہجرت کے ساتھ ان کے بزرگوں سید محمد اسماعیل، سید محمود المعروف پیر سباک، سید فرید الدین، سید زین الدین اور سید عبد الشکور کے حالات بھی مرقوم ہیں۔

کتاب میں سترہ حکایات پر مشتمل ایک باب ''خوارق عادات'' کے نام سے بھی شامل ہے۔ یہ حکایات تعمیر قلعہ اٹک ۹۹۱ھ/۱۵۸۱ء سے لے کر تصنیف قصۃ المشائخ ۱۱۴۶ھ/۱۷۳۳ء تک کے ڈیڑھ سو سال کے عرصے پر محیط ہیں۔ ان میں سے کوئی واقعہ ایسا نہیں جس کا رشتہ کسی نہ کسی طور سے اٹک سے مربوط نہ ہو۔ اس حصہ میں بعض دیگر صوفیائے کرام مثلاً سید سلطان صدر الدین، سید عیسیٰ بخاری حضرت حاجی بہادر کوہاٹی، صوفی محمد صالح بیگ نقشبندی مجددی اور شاہ عیسیٰ بھاکری کا ذکر بھی موجود ہے۔

قصۃ المشائخ کے آخر میں مصنف نے ایک تتمہ کی صورت میں اپنے آباء و اجداد کے حالات ''ذرا احوال بزرگان خود'' کے عنوان سے لکھے ہیں، جس کی تمہید میں مصنف نے لکھا ہے کہ مجھے حضرت عبد الرحمٰن جامی کی نفحات الانس اور مولانا علی حسین الواعظ کی رشحات

Marfat.com

عین الحیات کو دیکھ کر اپنے بزرگوں کے احوال و سوانح لکھنے کی ترغیب ہوئی ۔ اس کتاب کی تلخیص حضرت نذر صابری نے مرتب کر کے مجلس نوادرات علمیہ، اٹک، کے تعاون سے ۱۹۸۶ء میں شائع کی ۔

قصۃ المشائخ کے خطی نسخے درج ذیل کتب خانوں میں موجود ہیں:

☆ ۔ کتب خانہ ڈاکٹر سید چراغ حسین شاہ، آرمی فلیٹس، پشاور کینٹ ۔

☆ ۔ کتب خانہ سید ظہور حسین شاہ بخاری ایڈووکیٹ، پشاور کینٹ ۔

۳ ۔ حضرت شیخ ملا نصر اللہ اٹکی

حضرت شیخ ملا نصر اللہ بن عبدالسلام المعروف میاں ولی اٹک میں پیدا ہوئے ۔ تعلیم و تربیت اٹک میں پائی ۔ بعد ازاں اپنے والد بزرگوار کے ہمراہ موضع ٹھیکریاں (نزد کامرہ کینٹ) میں منتقل ہو گئے ۔ المرآۃ فی شرح اسماء المشکوۃ آپ کی تصنیف ہے ۔ المرآۃ کے آخر میں آپ نے ایک طویل مناجاتی نظم بھی لکھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ عالم اور شاعر بھی تھے ۔ آپ کے تین فرزند بدرالدین محمد، محمد عظیم اور محمد قدرت اللہ تھے جن کی اولاد چھچھ کے بعض دیہات میں ''شیخ صدیقی'' کے نام سے آباد ہے ۔ ۱۱۴۷ھ/۱۷۳۴ء میں وفات پائی اور موضع ٹھیکریاں ہی میں دفن ہوئے ۔ (۱۰)

المرآۃ فی شرح اسماء المشکوۃ میں اسماء مشکوۃ کو حروف تہجی کے اعتبار سے شرح کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے ۔

حدیث کی مشہور کتاب مشکوۃ المصابیح بغوی کی شرح اشعۃ اللمعات فی شرح مشکات کے عنوان سے حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے چار ضخیم جلدوں میں لکھی ہے جس میں آپ نے احادیث کی تشریح کرتے ہوئے رواۃ کی بھی تحقیق کی ۔ رواۃ کے یہ احوال و کوائف اشعۃ اللمعات میں بکھرے پڑے ہیں ۔ حضرت شیخ ملا نصر اللہ اٹکی نے ان اسماء الرجال کو المرآۃ فی شرح اسماء المشکوۃ کے عنوان سے کتابی صورت میں اواخر ذی الحجہ ۱۱۲۶ھ (۱۷۱۴ء) میں مرتب کرنا شروع کیا اور ۶ رجب المرجب ۱۱۲۸ھ (۱۷۱۶ء) کو اس کام سے فارغ ہوئے ۔ اس کتاب میں انہوں نے محض اشعۃ اللمعات یا اس کے مراجع و منابع کو نقل نہیں کیا بلکہ کئی دوسری ضخیم کتابوں سے بھی استفادہ کیا جن کے نام دیباچے میں مرقوم ہیں ۔

مصنف نے کتاب کی تمہید میں بتایا ہے کہ علوم حدیث میں اسماء الرجال کی تحقیق و تنقید

Marfat.com

ایک بڑا اہم فن ہے، کیونکہ صحیح وضعیف حدیث کی پہچان اور سنت وبدعت میں امتیاز کا انحصار اسی بات پر ہے۔ کتاب ایک دلآویز فارسی مناجاتی نظم پر ختم ہوتی ہے۔ المرآۃ فی شرح اسماء المشکوۃ کے خطی نسخے درج ذیل کتب خانوں میں موجود ہیں۔

- کتب خانہ خانقاہ فاضلیہ، گڑھی افغانان تحصیل ٹیکسلا ضلع راولپنڈی۔
- کتب خانہ فضلیہ، شیر گڑھ، ضلع مانسہرہ، ہزارہ۔

۴۔ حضرت شیخ عبدالشکور اٹکی

حضرت شیخ محمد عبدالشکور شاکر بن مولانا شیخ اسماعیل بن حضرت سرالاعظم مولانا شیخ محمد یحییٰ المعروف حضرت جی اٹک ۱۱۱۲ھ/۱۷۰۰ء میں اٹک میں پیدا ہوئے۔ آپ کی تعلیم وتربیت آپ کے دادا حضرت سرالاعظم کے زیر سایہ ہوئی۔ سلوک وتصوف کی منازل بھی ان ہی کی زیر نگرانی طے کر کے سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ میں خلیفہ مجاز ہوئے۔ آپ کی ساری زندگی اٹک ہی میں بسر ہوئی۔ درمیان میں کچھ عرصہ ۸۶-۱۱۸۳ھ/۷۲-۱۷۶۹ء نوشہرہ میں مقیم رہے۔ آپ کے اکلوتے فرزند احمد اور ان کی بیوی کا اسی شہر میں انتقال ہوا جس کے بعد آپ واپس اٹک تشریف لے آئے۔

آپ صاحب تصانیف عالم اور صاحب دیوان شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے وقت کے نامور فقیہ بھی تھے۔ آپ کا تخلص شاکر تھا۔ آپ کی دو تصانیف دیوان شاکر اور فاتح الدعاء شرح سامع الدعا مشہور ہیں۔ آپ کے بے شمار مریدین اور بعض خلفاء بھی تھے جن میں سے حضرت خواجہ عبدالرزاق پشاوری نے خاص طور پر بڑی شہرت پائی۔ آپ کی اولاد ایک فرزند احمد اور چار صاحبزادیوں پر مشتمل تھی۔

شیخ عبدالشکور شاکر نے اٹک میں وفات پائی اور حضرت سرالاعظم کی مزار کے مغرب کی طرف ایک چاردیواری میں آپ کی قبر واقع ہے۔(۱۱)

دیوان شاکر

گہرے بادامی رنگ کے کاغذ پر درمیانی تقطیع کے ۹۶ صفحات پر محیط، خوش خط جلی نستعلیق میں دیوان شاکر میں مختلف اصناف سخن مثلاً مناجات، قصیدہ، مثنوی، مسدس، تاریخ، مرثیہ، نوحہ، قطعہ، غزل، معما، مخمس، مستزاد، دوہا، دوبیتی، رباعی اور مفردات، سبھی کچھ شامل ہے۔

Marfat.com

دیوان میں آپ کے پیر ومرشد حضرت سرالاعظم کی تاریخ پیدائش وتاریخ وفات اور شجرہ طریقت بھی درج ہے۔ چودہ اشعار کے ایک قطعہ میں ایک فقہی مسئلہ بھی بیان کیا ہے۔ شاکر اٹکی کا تعلق ایک صوفی گھرانے سے ہے۔ آپ کی شاعری میں ہمیں عشق خداوندی کے ساتھ ساتھ پیر ومرشد سے غیر متزلزل عقیدت اور زن وفرزند سے بے پناہ محبت بھی دکھائی دیتی ہے۔ آپ کا تمام کلام محاسن شعری کا گنجینہ ہے۔

دیوان شاکر کا مذکورہ خطی نسخہ کتب خانہ صاحبزادگان، ملاں منصور، نزد اٹک میں موجود ہے۔

ان کے علاوہ آپ نے حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ سے منسوب ایک عربی دعا سامع الدعاء (۱۲) کی فارسی زبان میں شرح بھی بعض دوستوں کی فرمائش پر فاتح الدعاء کے نام سے تحریر فرمائی۔

کتاب کے شروع کے دس صفحات عربی سامع الدعاء کے لیے مخصوص ہیں اور اس کے بعد فاتح الدعاء شرح سامع الدعاء (۱۲) تحریر کی گئی ہے۔ شرح کے ساتھ حواشی، اشعار و معانی لغات فارسی وعربی بھی لکھے ہوئے ہیں۔ متن دعا ۲۹ مخمسوں پر مشتمل ہے۔ دعا کے بعد مناجات غوث الثقلین مسدس کی شکل میں درج ہے۔ اس نسخہ کے صفحات کے کناروں پر دوبیتی اور رباعی کے اشعار اور ساتھ میں بے شمار تعویذات لکھے ہوئے ہیں۔ خطی نسخے درج ذیل کتب خانوں میں موجود ہیں۔

- کتب خانہ گنج بخش، مرکز تحقیقات فارسی ایران وپاکستان، اسلام آباد، شمارہ ۱۱۹/۲۹۰۔
- کتب خانہ صاحبزادگان، ملاں منصور، نزد اٹک۔

منابع وحواشی

۱- تاریخ، تعمیر اٹک، ڈاکٹر غلام جیلانی برق، ڈسٹرکٹ بورڈ، اٹک، ۱۹۶۳ء۔
۲- دامن اباسین، سکندر خان، ملی کتب خانہ، وہسہ حضرو، اٹک، ۱۹۹۳ء، ص ۱۳۴۔
۳- اکبر نامہ، ابوالفضل علامی، نولکشور، کانپور ۱۸۸۳ء، جلد ۳، ص ۳۵۵
۴- تذکرہ مورخین، نبی احمد سندیلوی، اقبال پبلشرز، کراچی، ۱۹۶۸ء، ص ۱۷۲۔
۵- حضرت شیخ رحمت اللہ المعروف شیخ ''تلا'' حضرت عروۃ الوثقی خواجہ محمد معصوم مجددی سرہندی کے خلیفہ تھے۔

Marfat.com

آپ نے سورۃ یوسف کی پنجابی زبان میں تفسیر بھی لکھی تھی۔ ظواہر، میاں محمد عمر چمکنی، قلمی نسخہ، کتب خانہ کراچی یونیورسٹی، کراچی، ص ۵۵۰-۵۴۹۔

۶- میر علی شیر قانع ٹھٹھوی نے اپنی تصنیف تحفۃ الکرام (مرتبہ ۱۱۸۱ھ) میں شامل سندھ کے شاہان سمہ کے حالات اس کتاب سے لیے ہیں۔ دیکھیے تحفۃ الکرام، میر علی شیر قانع، تصحیح سید حسام الدین راشدی، سندھی ادبی بورڈ حیدر آباد ۱۹۷۱ء، رکن سوم، ص ۹۴۔

۷- پاکستان میں فارسی ادب کی تاریخ، ڈاکٹر ظہور الدین احمد، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۴ء، ص ۲۵۳-۲۵۱؛ تذکرہ مورخین، ص ۶۷-۶۶؛ فہرست مشترک نسخہ ہای خطی، احمد منزوی، مرکز تحقیقات فارسی ایران پاکستان، اسلام آباد ۱۹۸۸ء، جلد ۱۰، ص ۱۲۲-۱۲۱؛ وادی پوٹھوہار، رشید نثار، راولپنڈی، ۱۹۹۷ء، ص ۳۸۴-۳۸۲۔

۸- قصۃ المشائخ "احوال بزرگان خود" مرتبہ صابری، مجلس نوادرات علمیہ، اٹک، ۱۹۸۶ء؛ "تذکرہ علماء و مشائخ ضلع اٹک" راجہ نور محمد نظامی (قلمی) حضرت سرالاعظم مولانا شیخ محمد یحییٰ نقشبندی مجددی المعروف حضرت جی اٹک اور ان کے خلفاء، راجہ نور محمد نظامی (قلمی)؛ وادی پوٹھوہار، ص ۳۸۵، پاکستان میں فارسی ادب، ظہور الدین احمد، لاہور ۱۹۷۷ ج ۳، ص ۸-۳۸۵۔

۹- حضرت سرالاعظم مولانا شیخ محمد یحییٰ المعروف حضرت جی اٹک ۱۰۳۲ھ موضع سروالہ (نزد اٹک شہر) میں پیدا ہوئے۔ حضرت شیخ سعدی لاہوری کے خلیفہ اعظم تھے۔ ۱۱۳۲ھ میں وفات پائی۔ مزار اٹک میں دریائے سندھ کے کنارے واقع ہے۔

۱۰- المرآۃ فی شرح اسماء المشکوۃ، دیباچہ، ملا نصر اللہ اٹکی، (قلمی نسخہ)، خانقاہ فاضلیہ، گڑھی افغانان، المرآۃ فی شرح اسماء المشکوۃ ملا نصر اللہ اٹکی، مرتبہ نذر صابری مجلس نوادرات علمیہ اٹک؛ پاکستان میں فارسی ادب، جلد سوم، ۳۱۵-۳۱۴؛ وادی پوٹھوہار، ص ۳۸۶؛ کتب خانہ ہای پاکستان، محمد حسین تسبیحی، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان - اسلام آباد، ص ۲۴۱؛ "تذکرہ علماء و مشائخ ضلع اٹک" (قلمی)۔

۱۱- پاکستان میں فارسی ادب، جلد سوم، ص ۱۰۲-۱۰۱؛ وادی پوٹھوہار ص ۳۷۱؛ "حضرت سرالاعظم مولانا شیخ محمد یحییٰ نقشبندی مجددی المعروف حضرت جی اٹک، شاکر" تو قیر احمد ہمدرد بکسٹال، اردو بازار سرگودھا، ۱۹۹۵ء؛ دیوان شاکر، مرتبہ نذر صابری و سید رفیق بخاری، مجلس نوادرات علمیہ اٹک، ۱۹۷۰ء؛ دامن اباسین، ص ۲۳۰؛ سرالاعظم و خلفای او، مرتبہ نذر صابری، (قلمی)، مملوکہ راجہ نور محمد نظامی۔

۱۲- فہرست نسخہ ہای خطی، کتب خانہ گنج بخش، مرکز تحقیقات، محمد حسین تسبیحی، مرکز تحقیقات فارسی ایران پاکستان راولپنڈی، ۱۹۷۱ء ج ۱، ص ۳۲۹-۳۲۶۔

☆☆☆

Marfat.com

شمس العلماء میرزا قلیچ بیگ

سندھ کی ایک عظیم علمی اور ادبی شخصیت

فائزہ زہرا میرزا☆

قلیچ آن مرد دانای خردمند — بہ شعر و نثر فارسی بود پای بند
و لیکن شعر سندی دلربای است — تو گویی مظہر مہر و وفای است
قلیچ بیگ آمدہ گویای اسرار — محبت می کند از بجز دلدار"

شمس العلماء خان بہادر میرزا قلیچ بیگ کا شمار وادی سندھ کی ان منفرد شخصیات میں ہوتا ہے جنہوں نے سندھی زبان اور ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا اور اسے نئی جہتوں اور اصناف سے متعارف کرایا۔ انہیں اگر بیسویں صدی کے حوالے سے سندھی زبان کا سب سے اہم نثر نگار کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ آپ ۷/۱۰ اکتوبر ۱۸۵۳ء بمطابق ۹محرم الحرام ۱۲۷۰ھ کو حیدرآباد (سندھ) کے محلے ٹنڈو ٹھوڑو میں پیدا ہوئے۔(۲)

میرزا قلیچ بیگ میرزا فریدون بیگ گرجی کے تیسرے بیٹے تھے۔ میرزا فریدون بیگ کا اصل نام سڈنی تھا۔ میرزا قلیچ بیگ کے نانا میرزا خسرو بیگ اور ان کے والد میرزا فریدون بیگ روس کے صوبے جارجیا، یا گرجستان، کے شہر تفلس کے ایک عیسائی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے' اس لیے گرجی یا جارجین کہلاتے تھے۔ ۱۷۹۷ء میں ایران - روس جنگ کے دوران 'سڈنی' اور خسرو کے والدین قتل ہو گئے اور وہ دونوں ایرانی فوج کے ہاتھوں گرفتار ہو کر ایران کے دربار میں پہنچے۔ یہاں انہوں نے مذہب اسلام اختیار کیا۔ میرزا خسرو بیگ (میرزا قلیچ بیگ کے نانا) کو تہران میں رکھا گیا اور میرزا فریدون بیگ پہلے تبریز اور پھر اصفہان میں رہے۔ مرزا خسرو بیگ کو دربار ایران نے سندھ کے حاکم میر کرم علی خان ٹالپر، کے پاس بطور تحفہ بھیجا جنہوں نے اسے اپنا بیٹا بنا لیا کیونکہ میر صاحب کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ کچھ عرصے بعد جب میرزا فریدون بیگ کو بھی بطور تحفہ سندھ بھیج دیا گیا تو انہیں میرزا خسرو بیگ کے حوالے کیا گیا کیونکہ انکا تعلق ایک ہی وطن سے تھا۔ جب فریدون بیگ بڑا ہوا تو خسرو نے

☆ استاد یار زبان وادبیات فارسی، ایف جی مارگلہ کالج برائے خواتین، ایف سیون، اسلام آباد۔

Marfat.com

اپنی بیٹی کی شادی اس سے کردی۔ میرزا فریدون بیگ کے سات فرزند اور دو بیٹیاں ہوئیں۔
۱۸۴۳ء میں جب ٹالپروں کی حکومت کا خاتمہ ہوا تو میرزا خسرو بیگ اور میرزا فریدون بیگ نے میر کرم علی خان ٹالپر کے اہل خانہ ہی کے ساتھ ٹنڈو تھوڑو، میں مستقل سکونت اختیار کر لی جو نواب محمد خان تھوڑو کی جاگیر تھی اور جہاں اب تک ان کی اولاد رہتی ہے۔

میرزا قلیچ بیگ نے پڑوس کے مکتب میں قرآن پڑھا اور سندھی کے ساتھ فارسی اور عربی بھی سیکھنے لگے۔ انہوں نے اپنے بڑے بھائی میرزا صادق علی بیگ سے جو محکمہ تعلیم کے ایک اعلیٰ عہدیدار تھے انگریزی زبان سیکھی۔ مدرسے سے فراغت کے بعد انہوں نے گورنمنٹ اسکول میں داخلہ لیا جہاں ان کی ذہانت کے پیش نظر انہیں کئی انعام ملے۔ اس اسکول میں سندھی کی چار جماعتیں پڑھنے کے بعد انہوں نے حیدرآباد کے اینگلو ورنیکولر اسکول میں داخلہ لے لیا جہاں وہ ہر جماعت کے امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کرتے رہے۔ اس اسکول سے ۱۸۷۲ء میں انہوں نے بمبئی یونیورسٹی کے زیر انتظام میٹریکولیشن کا امتحان پاس کیا۔ اسی دوران قلیچ بیگ کی فارسی دانی سے متاثر ہو کر اسکول کی انتظامیہ نے انہیں چالیس روپے مشاہرہ پر فارسی استاذ مقرر کر دیا۔ میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد ۱۸۷۲ء میں قلیچ بیگ بمبئی روانہ ہوئے جہاں مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے انہوں نے الفنسٹن کالج میں داخلہ لیا۔ یہاں بھی انہیں ہر ماہ بیس روپے اسکالرشپ ملتا تھا۔ کالج میں بھی انہوں نے اپنا مضمون فارسی ہی رکھا۔ کالج کے فارسی کے استاد پروفیسر میرزا حیرت بیگ، قلیچ بیگ کو ان کی فارسی دانی کی وجہ سے بہت پسند کرتے تھے اور انہیں نہ صرف شاگرد بلکہ اپنے بیٹے کی طرح سمجھتے تھے۔ چنانچہ بالآخر ان ہی کی سفارش پر مرزا کو دوران تعلیم کالج کا فیلو مقرر کیا گیا۔ اسی طرح وہ کالج میں داخلہ لینے والے نئے طلبہ کو فارسی کی تعلیم دینے پر مامور ہوئے۔

میرزا قلیچ بیگ کو کالج میں فارسی کے مضامین میں ہمیشہ سو فیصد نمبر ملتے۔ اس زمانے میں انہوں نے فارسی شعر گوئی کی طرف زیادہ توجہ دی۔ وہ میرزا حیرت بیگ سے اپنے اشعار پر اصلاح لیتے تھے۔ انہوں نے ترکی زبان بھی میرزا حیرت سے سیکھی یہاں تک کہ اس زبان میں بھی شعر کہنے لگے۔ دوران تعلیم ہی ان کی والدہ کا ۱۸۷۶ء میں انتقال ہو گیا لیکن میرزا قلیچ بیگ کو اس اندوہناک اطلاع سے بے خبر رکھا گیا تاکہ ان کی تعلیم میں خلل واقع نہ ہو۔ انہیں اپنی والدہ کے انتقال کا پتہ اس وقت چلا جب وہ چھٹیوں میں حیدرآباد آئے۔ اس سانحے نے میرزا صاحب کو ہلا کر رکھ دیا اور وہ کئی دن تک مغموم اور اداس رہے۔ چھٹیوں کے اختتام پر

Marfat.com

وہ بحالت مجبوری بمبئی واپس گئے اور بی اے کا امتحان دیا لیکن شدت غم کی وجہ سے صحیح طور پر تیاری نہ کر سکے اور امتحان میں فیل ہو گئے۔ اس سے وہ اس حد تک دل شکستہ ہوئے کہ بیمار ہو کر ہسپتال میں داخل ہوئے۔ جہاں معالجوں نے بمبئی کی آب و ہوا کو ان کی صحت کے لیے مضر قرار دیا اور انہیں سندھ واپس جانے کا مشورہ دیا۔

سندھ واپس آ کر میرزا قلیچ بیگ اپنے بھائی میرزا صادق علی بیگ کے ساتھ کراچی میں رہنے لگے جہاں ان کی صحت بہت حد تک سنبھل گئی۔ کراچی میں قلیچ بیگ کا قیام تقریباً دو برس تک رہا۔ اسی دوران انہوں نے انگریزی میں شعر کہنے شروع کیے جو کراچی سے شائع ہونے والے اخبار سندھ نیوز میں شائع ہوئے۔ ان کے فارسی شعر بھی کراچی سے شائع ہونے والے اخبار مفرح القلوب میں چھپے۔ بقول میرزا قلیچ بیگ انہوں نے سات آٹھ سال کی عمر سے شعر گوئی کا آغاز کیا اور وقت کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ ان کے اشعار میں پختگی آتی گئی۔ کراچی میں قیام کے دوران میرزا قلیچ بیگ کو پشتو سیکھنے کا شوق ہوا اور انہوں نے پشتو گرامر اور ڈکشنری خرید لی اور پٹھانوں کی مدد سے پشتو سیکھنے لگے اور پشتو کے کئی شعر بھی یاد کر لیے۔

کراچی میں قیام کے دوران ہی میرزا قلیچ بیگ نے روزگار کی تلاش بھی شروع کر دی۔ انہوں نے بمبئی میں وکالت کے پہلے سال کا امتحان پاس کر لیا تھا۔ اس لیے کلکٹر کراچی سے اجازت حاصل کر کے کراچی کے تعلقہ دفتر میں دفتری خط و کتابت کی شد بد حاصل کی اور مجسٹریٹ کا امتحان دیا۔ اس امتحان میں وہ واحد امیدوار تھے جو کامیاب قرار پائے۔ اسی دوران کراچی ہائی اسکول میں فارسی کے استاد مقرر ہوئے جہاں چند ماہ پڑھانے کے بعد ضلع شکارپور کے تحصیل دار کے دفتر میں ہیڈ محرر کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا۔ اس وقت ان کی عمر پچیس برس تھی۔ اس عہدے پر تین مہینے تربیت حاصل کرنے کے بعد وہ تحصیل ''تھرڑی محبت'' میں تحصیل دار مقرر ہوئے جہاں ان کا قیام تین برس رہا۔ تھرڑی محبت سے تبادلے کے بعد قلیچ بیگ کچھ مدت تحصیل میہڑ، اور تحصیل جوھی میں رہے۔ اس کے بعد ان کا قیام تین برس تک تحصیل ''وارہ'' میں رہا۔

۲۵ دسمبر ۱۸۸۸ء کو قلیچ بیگ کی شادی کراچی میں سردار بہادر شیخ اسماعیل کی صاحبزادی سے ہوئی۔ اس وقت وہ گھوٹکی میں تحصیل دار تھے۔ بعدازاں ان کا تبادلہ روہڑی ہو گیا۔ ۱۸۸۹ء میں انہوں نے محکمانہ امتحان دیا اور ترقی پا کر شکارپور کے قائم مقام سٹی

Marfat.com

مجسٹریٹ مقرر ہوئے، جہاں سے بعد میں وہ ترقی پا کر بحیثیت ڈپٹی کلکٹر لاڑکانہ چلے گئے پھر وہ ''سیون ڈویژن'' کے انچارج مقرر ہوئے جہاں سے ان کا تبادلہ جیکب آباد کر دیا گیا۔ یہاں ان کا قیام تین برس رہا۔ جیکب آباد میں قیام کے دوران ہی انہوں نے بلوچی زبان سیکھی اور یہ زبان بھی روانی سے لکھنے پڑھنے اور بولنے لگے۔

۱۹۰۴ء میں حیدرآباد اور اسکے گرد و نواح میں طاعون کی بیماری پھیلی جس میں میرزا قلیچ بیگ کی بیگم بیمار ہو گئیں اور بالآخر ۱۹ مارچ ۱۹۰۴ء کو ایک بچی کی پیدائش کے دوران انتقال کر گئیں۔ اس حادثے کی وجہ سے قلیچ بیگ بہت غمگین اور اداس ہو گئے۔ وہ ملازمت سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے لیکن احباب کے مشورے پر انہوں نے اپنی ملازمت جاری رکھی۔ ان کی تنہائی اور غم کو محسوس کرتے ہوئے ان کے بھائی میرزا صادق علی بیگ نے مئی ۱۹۰۷ء کو ان کی دوسری شادی کر دی، لیکن دوسرے ہی برس مئی ۱۹۰۸ء میں وہ خاتون بھی ایک بیٹے کو جنم دیتے ہوئے انتقال کر گئیں۔ قلیچ بیگ اپنی اس اہلیہ کو بھی بہت چاہنے لگے تھے چنانچہ وہ بیمار پڑ گئے اور ملازمت سے تین ماہ کی چھٹی لے لی۔ چھٹیوں کے مکمل ہوتے ہی ۱۹۰۹ء میں تیس برس کی سرکاری ملازمت کے بعد انہوں نے پنشن لے لی اور اسی دوران اپنی ایک عزیزہ سے شادی بھی کر لی۔

اولاد:

میرزا قلیچ بیگ کے گیارہ بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ ان کی اولاد میں سے اکثر شعراء اور ادیب گذرے ہیں۔

ریٹائرمنٹ کے بعد کی مصروفیات:

پنشن کے وقت میرزا قلیچ بیگ کی عمر ۵۵ برس تھی۔ اس وقت سے لے کر اپنی وفات تک انکا زیادہ تر وقت لکھنے پڑھنے، عبادت و ریاضت اور رفاہ عامہ کے کاموں میں صرف ہوتا تھا۔ وہ نہ صرف اپنی کتابیں تصنیف و تالیف کرتے تھے بلکہ دوسرے لوگ بھی جو مواد انہیں نظر ثانی کے لیے بھیجتے تھے اس کی بھی تصحیح کرتے۔ وہ مختلف رسائل اور مخزنوں کے لیے مضامین لکھتے، شعر کہتے اور کتابوں کے مقدمے اور تعارف تحریر کرتے۔ وہ ٹیکسٹ بک کمیٹی کے ممبر بھی تھے، لہذا محکمہ تعلیم سے عربی، فارسی، اردو اور سندھی کی کتابیں ان کے پاس اظہار رائے کے لیے آتی تھیں۔ مختلف محکموں کے انگریز ملازموں کا سندھی زبان میں امتحان لینے کے لیے بھی ان سے رجوع کیا جاتا۔ وہ حیدرآباد میں تحفظ حیوانات کی سوسائٹی کے نائب صدر بھی رہے

Marfat.com

اور اس حوالے سے بھی انہوں نے کئی مضامین تحریر کیے۔

ادبی شہرت

میرزا قلیچ بیگ اپنی علمی بصیرت اور ادبی شہرت کی وجہ سے پورے سندھ میں پہچانے جاتے تھے۔ وہ سندھی ادب کی ایک قد آور شخصیت تھے جس کا علمی اور ادبی حلقوں کے علاوہ حکومتی حلقوں میں بھی احترام کیا جاتا تھا۔ انہیں شیکسپیر سندھ، سعدی سندھ، عمر خیام سندھ، اور بابائے سندھ کے نام سے بھی پکارا گیا۔ مرحوم حافظ محمد احسن چنا تاج الشعراء سندھ نے میرزا قلیچ بیگ کی شخصیت کو ان خطابات کا مستحق سمجھا ہے:

شعر (سندھی):

سند جو جامي، نظامي، انوري، سعدي آهو
کين گهٽ هو مير، غالب، داغ، سودا ذوق کان[۳]

(احسن)

ترجمہ: وہ (مرزا قلیچ بیگ) سندھ کے جامی، نظامی، انوری اور سعدی تھے۔ وہ میر، غالب، داغ، سودا اور ذوق سے کم نہ تھے۔

پاکستان کے سابق وزیر قانون جناب اے کے بروھی ان کے بارے میں یوں لکھتے ہیں: حدیث نبویؐ انا مدینة العلم و علیؓ بابھا کی طرح، سندھ کے بزرگ صوفی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی علوم سندھ کا شہر ہیں اور میرزا قلیچ بیگ اس شہر کا دروازہ ہیں۔ (۴)

میرزا صاحب نے نہ فقط سندھی زبان میں دادِ تحسین حاصل کی بلکہ دوسری ادبی زبانوں میں بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ فارسی، عربی، ترکی، انگریزی، اردو، سرائیکی اور بلوچی زبانیں بھی ان کی خدمات سے محروم نہیں رہیں۔ انکا قلم ہر موضوع پر رواں رہا ہے۔ چاہے وہ نظم ہو یا نثر، فلسفہ ہو یا حکمت، ادب ہو یا منطق، سائنس ہو یا ریاضی، تاریخ ہو یا جغرافیہ، سیاست ہو یا اقتصادیات، علم طب ہو یا طبیعیات، علم الحیات ہو یا علم کیمیا، افسانہ ہو یا ناول، ڈرامہ ہو یا تمثیل، علم بدیع ہو یا بیان، علم عروض ہو یا علم الاعداد، ظرافت ہو یا سنجیدگی، اخلاق ہو یا مذہب، دست شناسی ہو یا جادو، علم رمل ہو یا علم جفر، غرض یہ کہ دنیا کا شاید ہی کوئی موضوع ایسا ہوگا جس پر میرزا قلیچ بیگ نے کوئی تحریر یادگار نہ چھوڑی ہو۔

انہوں نے مشرق اور مغرب سے تعلق رکھنے والے شاعروں، ادیبوں، عالموں،

Marfat.com

مفکروں، دانشوروں، فلسفیوں اور صوفیوں کی مختلف کتابوں کا گہرا مطالعہ کیا اور ان کتابوں سے نثر اور نظم کے جوہر چن کر انہیں آسان سندھی زبان میں ترجمہ کیا۔ مختلف محافل، مجالس، ادبی اور مذہبی حلقوں میں انکی کی جانے والی تقاریر کی تعداد ۳۰ سے زیادہ ہے جن کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ بھی ایک معیاری تحقیقی کتاب سے کم درجہ نہیں رکھتیں۔ (۵)

تصانیف:

میرزا قلیچ بیگ کی تصانیف، تالیفات اور ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی مجموعی تعداد ۴۵۷ ہے جنکی تفصیل درج ذیل ہے:

۱- مختلف موضوعات پر انگریزی سے سندھی زبان میں ترجمہ کی ہوئی کتابیں	۶۹
۲- انگریزی میں لکھی ہوئی کتابیں	۴۱
۳- فلسفہ اور اخلاقیات کے موضوعات پر	۸۹
۴- سندھی ڈرامے	۲۰
۵- ناول اور کہانیاں	۲۳
۶- تعلیم نسواں پر لکھی ہوئی کتابیں	۱۹
۷- ادبی اور درسی کتابیں	۱۱۹
۸- بچوں کے لیے لکھی گئی کتابیں	۱۷
۹- سندھی نظم میں مختلف کتابیں ترجمہ اور طبعزاد	۲۹
۱۰- فارسی کتابیں	۲۲
۱۱- عربی کتابیں	۳
۱۲- اردو میں لکھی گئی کتابیں	۵
۱۳- بلوچی گرامر	۱
مجموعہ:	۴۵۷

سرزمین سندھ کے مشہور محقق پیر حسام الدین راشدی، میرزا قلیچ بیگ کی تصانیف کے بارے میں فرماتے ہیں (۶):

میں نے حساب کیا ہے کہ اگر قلیچ بیگ نے بیس سال کی عمر سے کتابوں کی تالیف اور شاعری کا آغاز کیا ہو، جیسا ان کی مجموعی تصانیف جنکی تعداد ۴۵۷ ہے، میرے اندازہ کے مطابق وہ ۵۷ برس کے عرصے میں ہر روز ۵۰ صفحہ تالیف، تصنیف اور ترجمہ کرتے تھے۔ (۷)

Marfat.com

بحیثیت مترجم:

میرزا قلیچ بیگ نہ صرف ایک اعلیٰ درجے کے مصنف تھے بلکہ انہیں ترجے میں بھی کمال حاصل تھا۔ انہوں نے شیکسپیئر کے ڈراموں کا اتنے خوبصورت انداز میں ترجمہ کیا۔ کہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ واقعات برصغیر کی سرزمین پر پیش آئے ہوں۔ اس کے علاوہ انہوں نے شرلاک ہومز کے جاسوسی ناولوں کا سندھی میں ترجمہ کیا۔ ان کے ترجمہ کردہ ناولوں میں وکٹر ہیوگو کا تصنیف کردہ ناول ''مصیبت ماریا، سائین سنواریا'' کے نام سے مشہور ہے۔ ان کی انگریزی زبان سے سندھی زبان میں ترجمہ کی ہوئی چند مشہور کتابوں کے نام یہ ہیں:

۱- مقالات الحکمت، ۱۸۷۷ء، *Bacon's Essays*
۲- گلیور جوسیر سفر، ۱۹۲۲ء *Gulliver's Travels*
۳- رومیوء جیولیٹ، ۱۹۱۷ء، *Romeo and Juliet*
۴- شاہ ایلیا، ۱۹۰۰ء، *King Lear*
۵- شرع محمدی، ۱۹۱۵ء *The Mohammadan Law*
۶- انکواٹری افیسر، ۱۸۹۷ء، *Inspector General*
۷- اسلام بموجب اصول تھیاسوفی ۱۹۲۳ء، *Islam According to Theosophy*
۸- یسوع مسیح جي سوانح عمری (منظوم)، ۱۹۱۹ء *Life of Christ (Verse)*
۹- باغ باغبانی، ۱۸۹۵ء، *A Manual of Horticulture*
۱۰- گلن جي ٹوکري، ۱۹۱۱ء، *The Basket of Flowers* (۸)

میرزا قلیچ بیگ نے تراجم کے انتخاب کے لیے صرف یورپی اور امریکی ادیبوں تک خود کو محدود نہیں رکھا بلکہ فارسی اور عربی ادب کو بھی سندھی کے قالب میں ڈھالا۔ انہوں نے گلشن راز شبستری، کیمیائے سعادت غزالی اور رباعیات عمر خیام کا فارسی سے سندھی میں اس خوبصورتی سے ترجمہ کیا جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

بحیثیت ناول نگار:

وہ پہلے سندھی ادیب ہیں جنہوں نے ناول نگاری، ڈرامہ اور مضمون نویسی کو سندھی ادب میں متعارف کروایا۔ پروفیسر لال سنگ اجوانی کے مطابق میرزا قلیچ بیگ کا پہلا طبع زاد ناول دلارام ہے جبکہ ان کا دوسرا ناول زینت ہے جو انہوں نے ۱۸۹۰ء میں تصنیف کیا۔ (۹)

Marfat.com

ڈاکٹر این میری شمل کے مطابق انکا ناول زینت تدریسی ادب میں ایک اہم مقام کا حامل ہے۔(۱۰)

میرزا قلیچ بیگ کے کچھ مشہور ناول درج ذیل ہیں:

۱- زنوبیه۱۹۱۴ء، ۲- با بادل ۱۹۱۴ء، ۳- وامق ء عذرا، ۱۹۲۴ء، ۴- راحیل۱۹۱۴ء، ۵- عجیب طلسم،۱۹۱۴ء، ۶- شیطان جی نانی۱۹۱۴ء، ۷-لچمی (لچهمی)، ۱۹۱۳ء، ۸- شیطان جو مرید، ۱۹۱۴ء، (۱۱)

بحیثیت تاریخ نویس:

تاریخ سندھ کے حوالے سے میرزا قلیچ بیگ نے کئی کتابیں تصنیف کیں جن میں سے ان کی کچھ مشہور کتابیں مندرجہ ذیل ہیں:

۱- چچ نامو، ۱۹۰۰ء　انگریزی میں (چچ نامه)
۲- چچ نامو　۱۹۲۳ء، سندھی میں (چچ نامه)
۳- سنده جي تاريخ　۱۹۱۰ء، انگریزی میں (سنده کي تاريخ)
۴- سنده جي تاريخ تصويرن سان، ۱۹۰۴ء، سندھی میں، (سندھ کی تاریخ تصاویر کے ساتھ)
۵- سنده جي مختصر تاريخ، ۱۹۱۵ء، سندھی میں، (سندھ کی مختصر تاریخ)
۶- سنده جا قديم شهر ۽ ان جا ماڻهو، ۱۹۲۲ء سندھی میں، (سندھ کے قدیم شہر اور ان کے مشہور لوگ)۔
۷- رياست خيرپور جي تاريخ، ۱۹۲۲ء، سندھی میں (ریاست خیرپور کی تاریخ)
۸- تالپرن جي صاحبي، ۱۹۲۸ء، انگریزی میں، (تالپڑوں کی حکومت) (۱۲)

وہ پہلے محقق تھے جنہوں نے شاہ عبداللطیف بھٹائی کا شاہ جو رسالو، ۱۹۱۸ء میں تصحیح اور ترتیب سے شائع کروایا جسے ان کے بعد آنے والے محققین نے شاہ لطیف کے مستند ماخذ کے طور پر استعمال کیا۔

انہوں نے اپنی خودنوشت سوانح حیات ''ساؤپن ياڪاروپنو'' جسے انہوں نے فارسی میں ''برگ سبز و دفتر سیاه'' کا نام دیا ہے، ۱۹۲۳ء میں تصنیف کی۔ ماہر لسانیات کی حیثیت سے انہوں نے بہت ہی اہم کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں:

۱- *Philological Curiosties, 1906*

Marfat.com

۲- Persian Etymology-1877,
۳-سندهي وياكرڻ چار حصے، (سندھی)،۱۹۲۱ء
۴-پهاكن جي حكمت (سندھی)،۱۹۲۵ء
۵-سندهي لغات قديمي،
۶- لغات لطيفي،۱۹۰۵ء
۷- رساله ٔ كريمي ،۱۹۰۵ء(۱۳)

میرزا قلیچ بیگ کے نزدیک خواتین کی تعلیم وتربیت کی بہت زیادہ اہمیت تھی۔ انہوں نے تعلیم نسواں کے حوالے سے بھی کئی کتابیں تصنیف کیں جن میں سے چند مشہور کتابیں یہ ہیں:

۱- اخلاق النساء،۱۹۰۴ء
۲- ہدایت النسوان ، ۱۸۸۰ء
۳-صحت النساء،۱۸۸۸ء
۴-تحفة النسوان ،۱۹۱۲ء(۱۴)

فارسی زبان وادب میں نمایاں خدمات:

میرزا قلیچ بیگ نے فارسی زبان وادب کے حوالے سے بھی نمایاں خدمات انجام دیں۔ انہوں نے مشہور فارسی شعراء اور ادبا کے علمی اور ادبی فن پاروں کا بغور مطالعہ کیا اور ان کے اشعار اور کتب میں سے اپنا انتخاب مرتب کیا۔ ان کی فارسی تالیفات درج ذیل ہیں:

۱-ابکار الافکار ، شش جلد،۱۹۰۶ء/۱۹۱۵ء/۱۹۲۲ء
۲-اشعار الامثال ، دو جلد،۱۹۲۷ء
۳- اشعار القرآن ، دو جلد،۱۹۲۷ء
۴-جواهر اللسان ، یک جلد،۱۸۷۲ء
۵-خزینه سیمین ، یک جلد،۱۹۲۸ء
۶-خزینه زرین، پنج جلد،۱۹۲۸ء
۷-در نجف ، یک جلد،۱۹۱۷ء
۸- ذکر الموت، یک جلد
۹-شعر الهنود، یک جلد،۱۹۲۴ء

Marfat.com

۱۰- شعر الملوک، یک جلد، ۱۹۲۸ء
۱۱- شعر النسوان، یک جلد ۱۹۲۸ء
۱۲- گرجی نامه، یک جلد، ۱۹۰۹ء
۱۳- مفتاح القرآن، یک جلد، ۱۸۸۸ء
۱۴- مرآت القرآن، یک جلد، ۱۸۸۸ء(۱۵)

میرزا قلیچ بیگ نہ صرف ایک نثر نگار تھے بلکہ انہوں نے بہت اچھی شاعری بھی کی۔ انہوں نے سندھی، اردو، انگریزی، فارسی اور ترکی زبان میں بھی شعر کہے۔ ان کے فارسی اشعار ان کی کتاب گرجی نامه (۱۹۰۹ء) میں موجود ہیں۔ ان کے سندھی اشعار کا مجموعہ دیوان قلیچ (۱۹۲۸ء) کے نام سے مشہور ہے۔ ان کی شاعری میں تقریباً تمام اصناف شعری مثلاً غزل، مثنوی، رباعی، قطعہ، مفردات، اور ہزلیات شامل ہیں۔ ان کے انگریزی اشعار ان کی کتاب *Leisure Hours. Part I-II* جو ۱۸۸۷ء تصنیف کی شامل ہیں۔

اسناد:

میرزا صاحب کی علمی اور ادبی خدمات کی قدر شناسی کرتے ہوئے انگریز حکومت کی طرف سے انہیں قیصر ہند چاندی کا تمغہ، سونے کی گھڑی ۱۹۰۶ء میں اور ۱۹۲۴ء میں شمس العلماء کا خطاب ملا۔ اس کے علاوہ اور کئی اسناد اور تحسین نامے بھی ملے۔(۱۶)

وفات

دنیاداری کے ساتھ ساتھ میرزا صاحب ایک متدین شخص تھے۔ وہ عبادات کے پابند تھے۔ انہیں خدا کی ذات پر کامل بھروسہ تھا اور وہ ہر وقت موت کو یاد کرتے تھے۔ ان کی ایک کتاب ذکر الموت کے نام سے بھی مشہور ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں ہی اپنے آبائی قبرستان میں اپنی قبر بنوالی تھی اور ہر جمعرات کو قبرستان جا کے کچھ دیر اس قبر میں لیٹتے تھے تاکہ اندازہ کر سکیں کہ مرنے کے بعد قبر میں کیا ہوتا ہوگا۔ وہ ہر سال اپنا قطعہ تاریخ وفات لکھتے تھے۔ انکا آخری قطعہ تاریخ وفات ان کی لوح مزار پر کندہ ہے:

عمرم بہ ہمین سال چو ہفتاد شدہ ہفت
آمد ملک الموت ز درگاہ حق آخر

Marfat.com

گفتا کہ بسی زیستی در منزل دنیا
شو عالم عقبیٰ کہ بہ بینی رخ داور
از فرط مسرت زدم آھی و بہ مردم
در عالم ارواح رسیدم دم دیگر
تاریخ وفاتم چو دلم خواستہ از غیب
ھاتف ز کرم کردندا: ''بجنت موقر''(۱۷)

۱۳۴۸ھ

شمس العلماء میرزا قلیچ بیگ نے ۳ جولائی ۱۹۲۹ء میں ۷۷ سال کی عمر میں وفات پائی۔ انہیں اپنے آبائی قبرستان بلند شاہ میں دفن کیا گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اگرچہ یہ علمی اور ادبی شخصیت ہمارے درمیان موجود نہیں مگر اپنے بے مثال اور نادر ادبی کارناموں کی وجہ سے ہمیشہ آسمان ادب پر ایک روشن ستارے کی طرح چمکتی رہے گی۔

منابع

نوٹ: میرزا قلیچ بیگ کی زندگی سے متعلق تمام حقائق ان کی خودنوشت سوانح عمری سا ؤپن یا کارو پنو، سے لیے گئے ہیں۔

۱- از گفتار رادیوئی جناب آقای دکتر محمد حسین تسبیحی (رھا) 'تاریخ ۳/۸/۲۰۰۰ء، فارسی۔
۲- شمس العلماء میرزا قلیچ بیگ'' سا ؤپن یا کارو پنو ''۱۹۲۳ء، ص ۱۳۸-۱۳۷، (سندھی)- انہوں نے اپنی ولادت کی تاریخ اس قطعہ میں رقم کی:

من چو زادم والد مرحوم من شد خوش یقین
شکر گفت الحمد للہ رب العلمین
فال نیک از من گرفت و طالعم ہم دید سعد
آن محرم ماہ بد تاریخ بودہ چارمین
بہر تاریخ ولادت نیک منظر (۱۲۷۰) مادہ یافت
باز یافت برحمتک ھم یا ارحم الرحمین (۱۲۷۰ھ)

۳- اعجاز علی بیگ میرزا، ''شمس العلماء خانبہادر مرزا قلیچ بیگ جون تصنیفات، انھن جی اشاعت ء قلمی نسخن جو آئینہ'' مقالہ سندھی، ص ۲
۴- مقالہ از آقای رشید فرزانہ پور، ''شرح احوال و آثار مرحوم شمس العلماء خان بہادر میرزا قلیچ بیگ،'' (فارسی)، ۲ مارس ۱۹۷۵م
۵- اعجاز علی بیگ میرزا، ص ۳

Marfat.com

۶- ایضاً، ص ۶-۵
۷- رشید فرزانہ پور Aijaz Ali Beg A.A.Mirza. *"List of the Books written by late Shams-ul-Ulema Khan Bahadur Kaleech Beg Feredun Beg Mirza Gurgi .1853- 1929."*
۹- روزنامہ جنگ (مڈویک ایڈیشن) ۳۰ جون ۱۹۹۹ء ص ۶ (اردو)
۱۰- Altaf Memon. "67th Death Anniversary of Mirza Kalich Beg" 1853-1929 *Heritage Magazine*.
۱۱- مضمون وار کتابن جی فہرست' کتاب ساؤپن یا کاروپنو، (سندھی)، ص ۲۳۱۔
۱۲- ایضاً ص ۲۳۶-۲۳۵،
۱۳- ایضاً،
۱۴- ایضاً،
۱۵- Aijaz Ali Beg A. Mirza. *List of Books....*
۱۶- مذکورہ بالا مقالہ سندھی از اعجاز علی بیگ میرزا، ص ۸
۱۷- ساؤپن یا کارو پنو، ص ۲۸۷

☆☆☆

Marfat.com

حافظ محمد عبداللطیف اکبر آبادی

ڈاکٹر سید محمد ظاہر شاہ☆

برصغیر میں مسلمانوں کے نزدیک عربی کے بعد فارسی ایک مقدس زبان سمجھی جاتی ہے کیونکہ اسلامی علوم کے اصل مآخذ عربی میں اور یا پھر فارسی میں ملتے ہیں، یہاں تک کہ ایک مشہور روایت کے مطابق قرآن مجید کا ترجمہ سب سے پہلے فارسی زبان ہی میں ہوا۔ اگرچہ فارسی کی سرکاری حیثیت تو ختم ہوگئی ہے لیکن علمی حلقوں میں ابھی تک یہ ایک زندہ اور تابندہ زبان ہے۔ جس علمی شخصیت کا ہم ذکر کر رہے ہیں انہوں نے فارسی نظم و نثر میں بہت کام کیا ہے۔ جب وہ ریاست دیر کے قاضی القضاۃ تھے تو انہوں نے عدالتی کاروائی کے لیے فارسی زبان ہی کا انتخاب کیا جس کا تفصیلی ذکر کسی اور نشست میں کریں گے۔ لیکن سب سے پہلے حکایت قد آن یار دلنواز کنیم:

آپ ۱۸۸۵ء میں ریاست دیر (حال ضلع دیر) کے درہ نہاگ کے ایک گاؤں ملاگجر میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ملک نور سید کا تعلق یوسف زئی قبیلہ کے ایک مشہور خاندان پائندہ خیل سے تھا۔ ریاست دیر کے نواب شاہ جہان المعروف چاڑا خان بھی اسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ خاندان ریاست دیر کے تین دروں یعنی درہ نہاگ، درہ عشیرے، اور درہ کارو میں آباد ہے۔ دیر کے ایک روحانی بزرگ حضرت اخوند الیاس لاجبوکیؒ بھی اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ اسی وجہ سے اس خاندان کو اخوند خیل بھی کہا جاتا ہے۔

بچپن میں والد صاحب کا سایہ حافظ صاحب کے سر سے اٹھ گیا اور آپ کی تربیت والدہ ماجدہ نے کی جو ایک پرہیزگار خاتون تھیں۔ چنانچہ آپؒ کی تعلیم و تربیت خالص دینی ماحول میں ہوئی۔ والدہ صاحبہ خاندانی بزرگوں کے واقعات بکثرت سناتیں جس سے آپ کو بچپن ہی میں علم دین حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوگیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب دیر، سوات اور مالاکنڈ ایجنسی پر اقتدار کے لیے امراء خان اور شریف خان کے درمیان رسہ کشی جاری تھی۔ امراء خان نے موخرالذکر کو علاقہ بدر کر کے اس علاقے پر قبضہ کرلیا تھا۔ اس کے بعد محمد شریف خان نے مردان میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ ۱۸۹۵ء میں انگریزوں نے امراء خان کے خلاف فوج کشی کر کے مالاکنڈ کے مقام پر اسے شکست دی اور سابق حکمران محمد شریف خان کو دوبارہ دیر کی سلطنت پر

☆ اسسٹنٹ پروفیسر اسلام آباد ماڈل کالج جی نائن فور اسلام آباد

Marfat.com

فائز کر دیا۔ اس کے بعد اس کے خاندان کے افراد نواب کہلائے۔

ادھر حافظ عبداللطیف صاحب ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد والدہ صاحبہ کی اجازت سے اپنے آبائی گاؤں سے حصول علم کے لیے روانہ ہوئے۔ اس وقت ضلع دیر کے موضع اُچ میں حضرت مولانا نقیب احمد صاحب کے والد ماجد فارسی نظم کی کتابیں پڑھایا کرتے تھے اور یہ درسگاہ فارسی علوم کا مرکز تھی۔ چنانچہ آپ نے اسی درسگاہ میں کئی سال تک کسب فیض کیا۔ مختصر گلستان و بوستان جناب مولانا نقیب احمد بھی آپ کے ہم درس تھے۔ اس دوران آپ نے کافی صعوبتیں جھیلیں۔ استاد محترم نے آپ کے اس شوق کو دیکھ کر آپ پر خصوصی توجہ دی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آپ بہت جلد اس قابل ہو گئے کہ فارسی نظم کی کتابیں دوسرے طلباء کو پڑھا سکیں۔ اس کے بعد آپ نوشہرہ چلے آئے۔ اس وقت نوشہرہ علماء کا مرکز تھا اور طلبا دور دور سے علم حاصل کرنے کے لیے یہاں آیا کرتے تھے۔ انگریزوں کی حکومت تھی۔ کوئی باقاعدہ دینی مدرسہ نہ تھا۔ لیکن علمائے کرام نامساعد حالات کے باوجود اسلامی علوم کے سیکھنے سکھانے کے لیے کوشاں تھے۔ آپ بھی ایک عرصے تک اسی ماحول میں رہ کر علم حاصل کرتے رہے۔

۲۱-۱۹۲۰ء میں آپ اپنے اساتذہ اور بزرگوں کی اجازت سے ہندوستان تشریف لے گئے جہاں آپ نے مدرسہ عربیہ میرٹھ محلہ اندرکوٹ میں داخلہ لیا اور ممتاز عالم دین شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالسلام قندھاری بارکزئی کے زیر سایہ علوم دینیہ کی تکمیل کی۔ واضح رہے کہ مولانا عبدالسلامؒ غورغشتی علاقہ چھچھ ضلع اٹک کے شیخ الحدیث جناب مولانا محمد قطب الدین ابن شہاب الدین غورغشتی کے شاگرد تھے۔ آپ نے قرأت کا نصاب استاد القراء حافظ ولی محمد البصیرؒ سے پڑھا۔

حافظ عبداللطیف صاحب چونکہ ابتداء ہی سے بڑے متقی اور حلیم الطبع واقع ہوئے تھے اس لیے آپؒ کے ہم جماعت آپ کو ''بزرگ مولوی صاحب'' اور کچھ لوگ آپ کو ''پٹھان مولوی صاحب'' کے نام سے یاد کرتے تھے جبکہ آپ اپنے لیے سلامت فقیر کا لقب پسند فرماتے تھے۔ آپؒ کی تصنیفات پر کئی جگہ آپ کے اسم مبارک کے بعد ''المعروف بہ سلامت فقیر'' لکھا ہوا ہے۔

حافظ صاحب کی سند فراغت پر ۲۵ شعبان ۱۳۴۴ھ بمطابق ۱۹۲۳ء کی تاریخ مرقوم ہے اس کے ساتھ ان علوم متداولہ کا بھی ذکر ہے جو آپؒ نے وہاں قیام کے دوران حاصل کیے مثلاً طب، میراث، منطق، قرأت، تفسیر، حدیث، معانی، کلام وغیرہ۔ آپؒ مذکورہ تمام علوم میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔

Marfat.com

درس و تدریس کا آغاز:

حافظ صاحب کی شہرت طالب علمی ہی کے زمانے میں دور دور تک پھیل چکی تھی فراغت کے بعد آگرہ (اکبرآباد) کے مدرسہ عربیہ شاہی مسجد کی انتظامیہ کی طرف سے آپؒ کو تدریس کے لیے دعوت نامہ موصول ہوا۔ چنانچہ اسی سال ۱۳۶۲ء/۱۹۴۳ء) میں آپ نے مذکورہ مدرسہ میں پڑھانا شروع کیا۔ دوران تدریس آپ نے اپنا علمی سکہ ایسا جمایا کہ انتظامیہ نے آپؒ کی قابلیت سے متاثر ہوکر دارالافتاء کا قلمدان بھی آپ کے حوالے کر دیا۔

مدرسہ عربیہ شاہی مسجد آگرہ کے مہتمم حضرت مولانا سعید احمد افغانیؒ نے آپؒ کی علمیت اور شرافت سے متاثر ہوکر آپ کو اپنی دختر نیک اختر نکاح میں دی اور اس طرح آپؒ کی ازدواجی زندگی کا آغاز ہوا۔ آپ تقریباً بیس (۲۰) سال تک مذکورہ مدرسہ کے صدر مدرس اور مفتی بھی رہے۔

بیعت کے لیے گولڑہ شریف کا سفر:

علوم ظاہری سے فراغت کے بعد آپؒ کے دل میں باطنی علوم کے حصول کا جذبہ موجزن ہوا اور ہمارے سلف صالحین کا یہی طریقہ رہا ہے کہ علوم ظاہری کے بعد وہ باطنی علوم کی طرف متوجہ ہوتے رہے ہیں۔ اس وقت برصغیر پاک و ہند میں آپ کے نزدیک چار ہستیاں ایسی تھیں جن سے روحانی فیض حاصل کیا جا سکتا تھا۔ ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں: حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت مولانا رکن الدین الوریؒ، حضرت مولانا سید مہر علی شاہؒ اور حضرت مولانا عبدالواحدؒ المعروف حاجی صاحب ترنگزئی۔

-آپؒ نے سب سے پہلے استخارہ کیا جو کہ ایک مسنون طریقہ ہے۔ اس طرح آپ نے ان چاروں کاملین کو اولیاء کی محفل میں دیکھا، لیکن آپ کو بیعت کے لیے پیر مہر علی شاہؒ کے بارے میں حکم ملا۔ اس طرح آپ نے آگرہ (ہندوستان) سے گولڑہ شریف کا سفر کیا۔ اس وقت تک اعلیٰ حضرت پیر سید مہر علی شاہؒ صاحب گولڑوی مرزا قادیانی پر فتح حاصل کر چکے تھے اور بڑے بڑے علمائے کرام آپ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہونا اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے، جن میں حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور حضرت مولانا عبدالغفور ہزاروی جیسے بڑے بڑے علماء بھی شامل تھے۔ جب آپؒ نے دربار گولڑہ شریف میں حاضری دی تو پیر صاحبؒ بہت خوش ہوئے، گویا آپ کے انتظار میں تھے۔ بقول مولانا رومؒ:

Marfat.com

ہر کہ او در عشق صادق آمد است
بر سرش معشوق عاشق آمد است

خلافت:

حافظ صاحب چونکہ مثنوی مولانا روم کے بڑے عالم تھے اور مثنوی شریف کو تصوف کا دائرۃ المعارف کہا جاتا ہے، اس لیے آپ نے جلد ہی سلوک کی منازل طے کرلیں اور اپنے مرشد پاک سے خرقہ خلافت حاصل کرکے ظاہری دعوت و ارشاد کے ساتھ ساتھ باطنی فیض کو بھی مخلوق خدا تک پہنچانا شروع کیا۔ چنانچہ آپؒ کے فیض یافتگان میں مخلوق خدا کی ایک بہت بڑی تعداد شامل ہے۔

حافظ عبداللطیف صاحب نے پہلا سفر حج آگرہ ہندوستان سے اختیار کیا۔ اس سفر میں آپؒ کے ساتھ عجیب وغریب واقعات پیش آئے، منجملہ یہ کہ آپ کی علمیت کے پیش نظر آپؒ کو خصوصی طور پر حرم محترم میں وعظ کرنے کی اجازت عطا ہوئی۔ وعظ میں آپ زیادہ تر مسنون داڑھی کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ کیونکہ وہاں پر اکثر لوگ داڑھی کو قینچی سے بہت چھوٹا کردیتے تھے ایک دن دوران وعظ چند اوراق کسی نے پس پشت سے آپ کے آگے پھینک دیے۔ آپؒ نے اٹھا کر دیکھے تو ان میں داڑھی کے بارے میں احادیث درج تھیں اور داڑھی رکھنے کا فلسفہ بیان کیا گیا تھا۔ جب آپ سفر حج سے واپس ہندوستان لوٹے تو ان احادیث کا اردو ترجمہ کیا جسے سورت کے ایک سیٹھ نے جو آپ کے معتقد تھے شائع کرواکر مفت تقسیم کیا۔

ایک سفر کے دوران چترال کے نواب یعنی مہتر چترال بھی جوکہ دیر کے نواب کے رشتہ دار تھے آپ کے ساتھ شریک تھے۔ مہتر چترال آپ سے کئی علمی نکتوں پر تبادلہ خیال کرتے رہے اور واپسی پر انہوں نے دیر کے نواب سے آپ کی بہت تعریف کی اور کہا کہ آپ کی قوم کے ایک بہت بڑے عالم ہندوستان کے شہر آگرہ میں مقیم ہیں اور شہر کے مفتی ہیں، اور ساتھ ہی یہ مشورہ بھی دیا کہ ان کو اپنے ہاں بلاکر کوئی اعلیٰ مذہبی عہدہ پیش کریں۔ چنانچہ شاہجہان نواب دیر نے ایک جرگہ ترتیب دیا جس میں نواب صاحب کے سپہ سالار ملک بازکن اور ''خزانے جانو'' کے علاوہ کئی دیگر خاص آدمی بھی شامل تھے۔ لیکن آپ نے ان کی دعوت قبول نہ کی۔ اس طرح دوسری تیسری مرتبہ جب جرگہ آپ کے پاس آیا تو شرکائے جرگہ نے آپ سے درخواست کی کہ ہم آخری مرتبہ آئے ہیں اور اگر آپ اپنی قوم کی اصلاح کے لیے اپنے وطن نہ لوٹے تو قیامت کے دن آپ اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ ہوں گے۔ آخرکار آپ مجبور ہوکر اپنے آبائی وطن دیر واپس تشریف لے

Marfat.com

آئے۔

نواب شاہ جہاں نے بڑی گرمجوشی سے آپ کا استقبال کیا اور آپ کو قاضی القضاۃ کے عہدے پر تعینات کیا۔ تقریباً دو سال تک آپ اس اہم اور کلیدی عہدے پر فائز رہے۔ اس دوران آپ نے نواب صاحب سے کوئی تنخواہ وغیرہ نہیں لی۔ بعد میں کچھ اختلافات کی بناء پر آپ نے اس منصب سے استعفیٰ دے دیا اور ہمیشہ کے لیے درویشانہ زندگی اختیار کر لی اور حقیقت حال میں اس شعر کا مصداق بن گئے۔

ہر گاہ کہ خبر یافتم از ملک نیم شب
من ملک نیم روز بہ یک جو نہ می خرم

دیر میں ایک عرصہ تک خلوت گزینی کے بعد آپ بالآخر خاموشی سے ہجرت فرما کر مردان تشریف لے گئے۔ جہاں آپ نے ۱۳۷۱ھ میں ایک دینی مدرسہ انوار العلوم کے نام سے قائم کیا جہاں دیگر مدرسین کے علاوہ آپ خود بھی دورۂ تفسیر اور دورۂ مثنوی پڑھاتے۔

مردان کا ایک ہندو پنڈت آپ کے پاس بہت آیا کرتا تھا وہ آپ سے بہت متاثر تھا۔ وہ مدرسہ کے طلباء کے لیے کپڑے تک خرید کر پیش کرتا۔ آخر میں اس نے اسلام قبول کرنے کا ارادہ کیا لیکن خاندانی پابندیوں کی وجہ سے وہ ظاہراً اس فضیلت سے محروم رہا اور بعد میں اسے آپ کے پاس آنے سے روک دیا گیا۔

حافظ عبداللطیف صاحب کے خلفاء اور متوسلین سینکڑوں کی تعداد میں ہیں جن میں خاکسار راقم کے علاوہ عربی علوم کے علاوہ فارسی علوم کے بہت بڑے عالم حضرت مولانا محمد احسان اللہ جان قادریؒ، مہتمم دارالعلوم ناجیہ پشاور شہر و مدیر و بانی ماہنامہ الناجیہ جو گذشتہ سال انتقال فرما گئے، پاکستان کے سابق وفاقی وزیر اور سینیٹر خان محمد علی خان آف ہوتی، معروف صوفی اور طبیب حضرت مولانا حکیم سید محمود شاہ صاحب (شبقدر چارسدہ) پشتو اور اردو کے صاحب طرز شاعر اور ادیب اور ماہر آثار قدیمہ قاضی سید فیروز شاہ اثر گیلانی (اکبر پورہ، پشاور) جیسی ممتاز شخصیت شامل ہیں۔

آثار:

حافظ عبداللطیف صاحب نے درس و تدریس اور بیعت و ارشاد کے ساتھ ساتھ اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے طلباء و علماء کے لیے کئی ایسی منظوم و منثور کتابیں بھی لکھیں جن سے عام لوگ مستفید ہو سکتے ہیں۔ یہ کتابیں، عربی، فارسی، اردو اور پشتو میں ہیں۔ آپکے بعض آثار درج ذیل ہیں:

Marfat.com

۱- کاشف البیان:

تفسیر قرآن (پہلا پارہ) آپ نے مثنوی کی بحر میں یہ منظوم تفسیر لکھی ہے۔ آیات کا ترجمہ اردو نظم میں ہے جبکہ تفسیر فارسی نظم مین ہے۔ اس تفسیر کو نامکمل چھوڑنے کے متعلق آپ نے راقم الحروف کو بتایا کہ ایک مرتبہ مولانا جلال الدین رومی نے مجھے خواب میں فرمایا: اگر آپ یہ تفسیر لکھیں گے تو میری مثنوی کی وقعت کم ہو جائے گی۔ اس لیے آپ نے یہ ارادہ ترک کر دیا اور بجائے نظم کے نثر میں ایک اعلی پائے کی تفسیر یادگار چھوڑی۔

۲- تفسیر کاشف البیان اردو (منثور):

یہ تفسیر نہایت شستہ اور سلیس اردو زبان میں لکھی گئی ہے اور چھ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ دراصل یہ تفسیر آپ کے شاگرد اور معتقد خاص جناب محمد علی خان آف ہوتی (سابق وفاقی وزیر تعلیم حکومت پاکستان) کے ان دروس کا مجموعہ ہے جو انہوں نے دس سال کے عرصہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر مکمل کیے۔ محمد علی خان آف ہوتی اس تفسیر کو چھپوا کر مفت تقسیم کرتے ہیں اور اب تک اس تفسیر کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔

۳- لطائف المعانی اردو شرح "شرح ملاجامیؒ":

یہ علم نحو کی ایک معتمد علیہ کتاب شرح ملا جامیؒ کی اردو شرح ہے۔ جو کہ ۵۵۶ صفحات پر مشتمل ہے، جسے آپ نے اپنے پیر و مرشد حضرت پیر سید مہر علی شاہؒ کے نام سے معنون کیا ہے۔ تاریخ تکمیل ۱۳۵۴ھ ہے۔ کتاب کا دیباچہ عربی میں ہے۔ جس سے آپ کی عربی دانی اور علمیت کا پتہ چلتا ہے۔ آپ نے دیباچہ میں اپنی پیر و مرشد کو فارسی زبان میں منظوم خراج عقیدت پیش کیا ہے اور ساتھ ہی ان کا شجرہ نسب بھی نہایت عقیدت کے ساتھ نقل کیا ہے۔ کتاب سوالاً جواباً ہے اور علم نحو کے طالب علم کے لیے نہایت مفید ہے۔ اس کی پہلی اشاعت آگرہ میں عمل پذیر ہوئی، جبکہ دوسرا ایڈیشن مردان (صوبہ سرحد) سے شائع ہوا۔ آجکل یہ کتاب نایاب ہے۔

۴- شرح فی المجاز اردو شرح دیوان حافظ شیرازیؒ:

۲۲۴ صفحات پر مشتمل یہ دیوان حافظ شیرازی کے پہلے نصف کے اشعار کی تشریح ہے۔ اس کی تاریخ اشاعت ربیع الثانی ۱۳۴۸ھ بمطابق ۱۹۳۰ء ہے۔ یہ آپ کی پسندیدہ تصنیفات میں سے ہے۔ آپ نے یہ شرح لکھ کر آگرہ ہندوستان جیسے علم و ادب کے گہوارے کے جن شعراء اور ادباء سے داد تحسین حاصل کی ان میں اردو اور فارسی کے ممتاز شاعر اور ادیب سیماب اکبر آبادی سر فہرست ہیں۔

Marfat.com

۵- تحفتہ الذاکرین:

یہ یومیہ وظائف کی کتاب ہے اس میں سلسلہ چشتیہ نظامیہ اور قادریہ کے اسباق اور دیگر اوراد شامل ہیں۔

۶- تحفتہ الواعظین:

یہ رسالہ واعظین حضرات کے لیے لکھا گیا ہے۔ موضوع کی مناسبت سے جگہ جگہ مثنوی شریف کے اشعار بھی اس میں درج ہیں۔ نہایت مفید رسالہ ہے۔

۷- تحریم حلق لحی و شرب دخان:

اس رسالہ میں داڑھی، حقہ، بیڑی اور سگریٹ کے بارے میں بیان ہے یہ عربی رسالہ آپ کو میزاب رحمت میں تقریر کے دوران غیبی طور پر ملا تھا۔ آپ نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا اور سورت شہر کے ایک سیٹھ نے جو آپ کا معتقد تھا اجمل پریس بمبئی نمبر۳ سے شائع کرا کر اسے مفت تقسیم کیا۔ یہ رسالہ دوسری مرتبہ مردان صوبہ سرحد سے شائع ہوا اور آج کل ناپید ہے۔

۸- در مکنون (پشتو):

یہ علامہ عبدالحی لکھنوی کے رسالہ الفلک المشحون کا پشتو ترجمہ ہے۔ اس میں رہن کے مسائل ہیں۔ یہ رسالہ بہت مفید ہے کیونکہ رہن کے مسائل سے اکثر لوگ ناواقف ہوتے ہیں۔ اس کا ایک نسخہ دارالعلوم ناجیہ پشاور کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

۹- فتاویٰ شہابیہ (فارسی)

یہ ۱۰۸ صفحات پر مشتمل ایک مجموعہ فتاویٰ ہے۔ پرانے وقتوں میں چونکہ فارسی زبان کا چرچا زیادہ تھا اس لیے آپ نے مذکورہ فتاویٰ فارسی زبان میں لکھے ہیں۔ تاریخ اشاعت ۲۰ محرم ۱۳۷۹ھ ہے۔ مولانا رحیم گل اسماری فاضل دیوبند نے اپنے مکتبہ سے اسے شائع کیا ہے۔ چونکہ اس رسالہ کی اشاعت میں سابق والی ریاست جندول نواب شہاب الدین خان نے دلچسپی کا اظہار کیا تھا اس لیے یہ انہی کے نام سے منسوب ہے۔ اس فتاویٰ کے شروع میں اس فن کے رہنما اصول بیان کیے گئے ہیں جن کا علم ایک مفتی کے لیے ازبس ضروری ہے۔

۱۰- انسان کی حقیقت

آپ چونکہ عالم ہونے کے ساتھ ساتھ روحانیات کے اسرار و رموز سے بھی واقف تھے، اس لیے آپ نے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے رسالہ جہاد اکبر کی طرز پر ایک رسالہ تحریر فرمایا اور اس میں انسان کو عالم اکبر ثابت کیا ہے اور

Marfat.com

انسان کے اندر روحانی اور شیطانی طاقتوں کی کشمکش کے بارے میں تفصیلی بحث کی ہے۔

وصال:

آپ بروز ہفتہ ۱۶ نومبر ۱۹۹۱ء بمطابق ۹ جمادی الاول ۱۴۱۲ھ بوقت ۴ بجے صبح صادق اس دارفانی سے تشریف لے گئے۔ جنازہ ۳ بجے سہ پہر ہوا۔ دارالعلوم مردان کے احاطے میں دفن کیے گئے۔ راقم الحروف کو لحد میں اتارنے کا شرف حاصل ہوا۔ آپ کی صلبی اولاد کوئی نہیں لیکن روحانی اولاد ہزاروں کی تعداد میں مسلمانوں کو فیض پہنچا رہی ہے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است برجریدہ عالم دوام ما

مآخذ

مقالہ ہذا کا بنیادی مآخذ آپ کی اپنی تصنیفات اور خاکسار راقم کی آپ کی خدمت میں طویل نشستیں ہیں۔ ان کے علاوہ مقالہ ہذا کی تحریر میں مندرجہ ذیل مصادر سے بھی مدد لی گئی ہے:

۱- علمائے سرحد کی تفسیری خدمات از زینب جدون، حرا بک ڈپو، راولپنڈی۔
۲- تذکرہ لطیف از حکیم سید محمود شاہ بخاری' خانقاہ چشتیہ مدہ شبقدر، چارسدہ، ۱۹۸۸ء۔
۳- تفسیر کاشف البیان از مفتی سید محمد طاہر شاہ، ماہنامہ فکر و نظر اسلام آباد، بابت ماہ دسمبر ۱۹۸۲ء۔
۴- اردو ڈائجسٹ، قرآن نمبر۔
۵- مہر انور، از شاہ حسین گردیزی، دارالعلوم مہریہ، گلشن اقبال، کراچی۔
۶- پرتو مہر، از ڈاکٹر سید محمد طاہر شاہ، مکتبہ نفیسیہ ملتان، ۱۴۱۹ھ۔
۷- نغمہ عشاق، از مولانا مولوی محمد نور اللہ بھیرانوی، صدیقیہ پریس، ملتان

☆☆☆

Marfat.com

سرسوتی سرن کیف

فارسی کا ایک غیر مسلم معاصر شاعر

ڈاکٹر آصفہ زمانی ☆

ہندوستان میں فارسی شعر و ادب کی تقریباً چھ سو سالہ جاندار اور وقیع روایت رہی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ تیموری دور (۹۳۲-۱۲۷۵ھ) میں فارسی ادبیات کی جو عظیم روایت سامنے آئی' اس کی جڑیں یہاں کی سرزمین میں اس قدر گہرائی سے پیوست ہیں جس کی بیخ کنی آسان نہیں۔

فارسی کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انیسویں صدی عیسوی میں جبکہ با قاعدہ اردو زبان و ادب کا چلن ہو چکا تھا' اس وقت بھی فارسی میں شعر کہنا شعراء کے لیے مایہ افتخار سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ اردو کے چوٹی کے شعراء مثلاً میر تقی میر (م ۱۸۱۰ء)' نیاز بریلوی (۱۷۵۹-۱۸۳۴ء) مومن خاں مومن (م ۱۸۵۲ء) اور مرزا غالب (۱۷۹۷-۱۸۶۹ء) کا شماران ذوالللسانین شعراء میں ہوتا ہے جنہوں نے اردو کے ساتھ ساتھ فارسی میں بھی قابل قدر اضافے کیے۔

بیسویں صدی کا نصف اول بھی فارسی شعر و ادب کے لیے مایوس کن نہیں تھا۔ شبلی نعمانی (۱۸۵۷-۱۹۱۶ء)' خواجہ عزیز الدین عزیز (م 1915)' شیخ غلام قادر (م ۱۹۲۷ء) گرامی (۱۹۲۷ء) اور اقبال لاہوری (۱۸۷۶-۱۹۳۸ء) فارسی شعر و ادب کے وہ درخشندہ ستارے ہیں جنہوں نے فارسی شعر گوئی کی اس روبہ زوال عہد میں بھی اس کی عزت و آبرو قائم رکھی۔

آزادی کے بعد حالات نے کچھ ایسی کروٹ لی کہ فارسی کا مستقبل ہندوستان میں بالکل تاریک نظر آنے لگا لیکن فارسی دنیا کی ایسی جاذب و پرکشش زبان ہے جس کی لطافت کا نشہ آسانی سے اترنے والا نہیں۔ چنانچہ اس دور میں بھی جب کہ فارسی شعر گوئی کی روایت بہت کمزور ہے فارسی کی طرف متوجہ ہونے والے ناپید نہیں۔

کسی زبان کے زندہ و پائندہ ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس میں اظہار

☆ صدر شعبہ فارسی دانشگاہ لکھنؤ - انڈیا

Marfat.com

خیال کرنے والوں میں ہر مذہب و فکر کے لوگ شامل ہوں۔ ہمیں یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ فارسی زبان کا وہ شعر و ادب جس نے ہندوستان میں نمو پائی اس کی آبیاری میں غیر مسلم حضرات کا خون جگر بھی شامل ہے۔ دور اکبری سے باقاعدہ یہ سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ آخری مغل دور میں ان کی خاصی تعداد نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر آنند رام مخلص (م ۱۱۷۵۰ھ)، بندرابن داس خوشگو (۱) (مؤلف سفینہ خوشگو) (۱۰۸۸/۷-۱۱۷۰ھ) شاگرد بیدل، لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی (۲) (۱۱۵۸-۱۲۲۳ھ) اور موہن لعل انیس و بھگوان داس بسمل (۳) و ہندی (پ: ۱۱۶۴ھ) شاگردان محمد فاخر مسکین وغیرہ کی شعری و نثری تخلیقات فارسی کی مرہون منت ہیں۔

انیسویں صدی میں بھی رتن سنگھ زخمی (۱۷۸۲-۱۸۵۱ء) ہرگوپال تفتہ (ہمعصر غالب) وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں جنہوں نے فارسی کو اپنے خیالات و افکار کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اٹھارھویں انیسویں صدی کے کشمیری ہندو شعراء کی ایک بڑی تعداد بہار گلشن (۴) مرتبہ برج کشن کول پنجر و پنڈت جگموہن ناتھ رینہ شوق میں اور نوابین اودھ کے فارسی گو ہندو شعراء کی فہرست ڈاکٹر نریندر بہادر شریواستو کے پی ایچ ڈی کے مطبوعہ مقالہ بعنوان نوابی عہد کے ہندوؤں کا فارسی ادب میں یوگ دان میں دیکھی جا سکتی ہے۔ (۵) ہندوستان میں ۱۹۴۷ء کے بعد جو نسل پروان چڑھی اس میں کہنہ مشق غیر مسلم شعراء کی تلاش شاید آسان نہ ہو لیکن وہ غیر مسلم شعراء جنہوں نے آزادی سے پہلے آنکھ کھولی اور انہوں نے آزادی کے بعد کا زمانہ بھی پایا' ان میں غیر مسلم فارسی شعراء شاذ و نادر ہی سہی لیکن بالکل مفقود بھی نہیں۔ اس سلسلہ کا ایک معتبر نام سرسوتی سرن کیف کا ہے۔ ان کی فارسی شاعری پر ایک ناقدانہ نگاہ ہمارا آج کا موضوع ہے۔

سرسوتی سرن کیف ۲۰ نومبر ۱۹۲۰ء کو مین پوری (آگرہ کمشنری) میں پیدا ہوئے۔ پیشے کے اعتبار سے صحافی ہیں پانیر اور Tribune (چندی گڑھ) میں نائب مدیر کی حیثیت سے کام کیا۔ کچھ عرصہ کانپور اور بنارس کے اردو اخباروں سے بھی وابستہ رہے۔ سبکدوشی کے بعد بنارس میں مقیم ہیں۔

کیف کا شمار ماہرین لسانیات میں ہوتا ہے۔ انہیں بیک وقت ہندی' انگریزی' اردو' فارسی' سنسکرت' عربی' فرنچ اور جرمن آٹھ زبانوں پر عبور حاصل ہے۔ کیف کی زندگی کا بیشتر حصہ تصنیف و تالیف میں گذرا۔ ان کی اب تک تیس سے زائد کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہو کر ناقدین ادب سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ ان میں بھاگوت گیتا کا منظوم

Marfat.com

اردو ترجمہ' غالب و چکبست سے متعلق انگریزی کتاب Development of Urdu Poetry اور صوتیات سے متعلق ان کی تصنیف India's National Writings وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ تنقیدی کتب کے علاوہ انہوں نے پانچ ناول بھی قلم بند کیے ہیں۔ فارسی غزلیات کا مجموعہ لذت کرب (۶) کے نام سے ۱۹۸۸ء میں ول پبلی کیشنز بمبئی سے شائع ہو چکا ہے۔ لذت کرب ساٹھ غزلیات' دو خمسوں اور تین رباعیات پر مشتمل ہے۔ مجموعہ مختصر ہے لیکن ان کے پختہ شعور کا غماز ہے۔

فارسی میں شعر کہنے کی رغبت کیوں کر پیدا ہوئی' اس کے متعلق لذت کرب میں ''عرض ناشر'' کے عنوان کے تحت یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

... در شعر پارسی از اوایل عمرم دلکشی غیر معمولی می داشتم. ومن ھمچو فراق گورکھپوری این موقف استوار کردم کہ لطافت زبان و بیان کہ در پارسی ھمہ جا موجود است' در اردو ممکن نباشد' خصوصا دربارہ احساسات شعری۔ کاخ شعر اردو بہ بنای پارسی ایستادہ است ... علاوہ ازین اسلاف قدری اثاثہ شعری در زبان پارسی گذاشتہ اند واین امر مرا تحریک دادہ است برای موزون کردن شعر فارسی ... (۷)

کیف کا شمار اگرچہ بیسویں صدی کے شعراء میں ہوتا ہے لیکن وہ متقدمین شعراء کے پیرو اور روایتی اسالیب کے پابند ہیں۔ لیکن وہ محض روایت پرست نہیں ان کا کلام ان کے احساسات و تجربات کا نچوڑ ہے۔ خود فرماتے ہیں:

... من دربارہ ثقافت و ادب قایل ارتقاھستم نہ قایل انقلاب' وھمہ طریقہ ھای پیشرویان را دوست دارم ... با این ھمہ دعویٰ می آرم کہ شعر من روایت پرستی نمی باشد۔ ھرچہ بطور شخصی محسوس کردہ ام بہ ہیولیٰ شعر آوردہ ام۔ (۸)

چونکہ کیف کی عشقیہ شاعری غزل کی روایتی فضا میں سانس لے رہی ہے لہٰذا متقدمین شعراء کا ذکر ناگزیر ہے۔ واضح ہو کہ اس سے کسی قسم کا موازنہ مقصود نہیں صرف موضوعاتی اعتبار سے غزل کے قدیم رنگ سخن کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ روایتی غزل کی فضا کا دارومدار عاشق، معشوق اور رقیب کی تکون پر قائم ہے۔ جہاں عاشق ہمیشہ بے چارہ اور مظلوم رہا ہے اور معشوق بلا کا حسین لیکن سفاک اور ظالم اور اس پر مستزاد رقیب کی ریشہ دوانیاں۔ محبوب کی کمسنی اور نوخیز خوش جمالی کے سامنے ارباب کمال از خویش رفتہ نظر آتے ہیں۔ کیف بھی تیر نگاہِ نگار کمسن کے زخم خوردہ ہیں:

چہ نگار کمسن و سادہ رو کہ بپا بکرد قیامتی
چہ نگاہ سادہ و دلنشین کہ ببرد صبر و قرار ما (۹)

Marfat.com

اور کمسنی میں شوخی وطرحداری کا پایا جانا از بسکہ ضروری ہے:

گہی ستم گہی دلبستگی کند آن شوخ
بہ ہر طریق فزون تشنگی کند آن شوخ (۱۰)

محبوب کا جمال جہاں آزا ہمیشہ صید فگن رہا ہے۔ کیف کو تو یہاں خدا یاد آ گیا:

تا رخ تو دیدم نہ نگارا
کردہ نہ بودم یاد خدارا (۱۱)

''نرگس نیم باز'' نے کتنوں کو مست بنا رکھا ہے۔ خسرو نے اس مستی میں نہ جانے کتنی قیامت خیزیوں کا نظارہ کر ڈالا:

چہ بلاست از دو چشمت نظر بہ ناز کردن
مژہ را کشاد دادن در فتنہ باز کردن

کیف نے اس کی مستی و سرشاری میں جلوۂ صدرنگ کا تماشا کیا ہے:

مرا چشمت کند سرشار ساقی
نہ یک قطرہ چشیدہ ام ز جامت (۱۲)

مگر نہ کیف شدی مست دور چشمانش
چرا کنی طلب از ساقیت ایاغ شراب (۱۳)

بیہوش شویم چون سوی ما
آن نرگس نیم باز گردد (۱۴)

''کشیدہ قامتی'' کا بیان پیکر تراشی کا ایک جز ہے اسے ''سرو'' سے تشبیہ دے کر شعراء نے محبوب کی کشیدہ قامتی میں ستارے ٹانکے ہیں۔ لیکن خسرو کا لطف نظر ملاحظہ ہو انہیں سرو سے تشبیہ دینا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ بھلا ایسی بے ہنگم کشیدہ قامتی میں کیا حسن؟

نی سروای شاخ طرب، کان قامت زیبا سلب
از نقرہ خام ای عجب نخل است موزون ریختہ

لیکن حافظ کو سرو کا استعارہ بھا گیا۔ یہ اور بات ہے کہ راست گوئی پر زباں کتر دی جائے:

قامتش را سرو گفتم سر کشید از من بہ خشم
دوستان از راست می رنجد نگارم چون کنم؟

کیف اس کی سرو قامتی کی قیامت خیزیوں سے متاثر ہیں:

Marfat.com

ترا تا دیدہ ام ای سروقامت
مدام افتادہ بردل یک قیامت(۱۵)

لالہ رخ موکمر سروقامت
از چہ ورزی بمن این عداوت(۱۶)

محبوب کی خونخواری اور عاشق کی بیچارگی روایتی غزل کی نشان گر ہے۔ خسرو تو اس کی خونخواری کی دعا کرتے ہیں:

ھمہ گویند کز خون خواری اش خلقی بجان آمد
من این گویم کہ بہر جان من خونخوارہ تر بادا

اور حافظ گالیاں کھا کے بھی بے مزہ نہیں ہوتے:

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی
زبان تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

کیف بھی کچھ اسی کیفیت سے دوچار ہیں:

وای بدبختی کہ از لعل لبش
گوش من داند نہ جز دشنام را(۱۷)

مشو تلخ برشائق خود نگارا
کہ نفرت نباشد جواب محبت(۱۸)

عاشق کو معشوق سے کرم کی امید نہیں۔ یہاں عتاب نہ ہو تو عتاب معلوم ہوتا ہے۔

ز تو امید کرم ھیچ من نمی کردم
ولی عتاب شود چون بمن کنی نہ عتاب(۱۹)

محبت عذاب جاں ہے۔ اس کا معاملہ تو ''روی دریا سلسبیل وقعر دریا آتش است'' کا سا ہے۔ اس کا اندازہ تو کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے اس بحر میں غوطہ زنی کی ہو۔ کیف نے "محبت" ردیف میں ایک مسلسل غزل کہی ہے۔ یہاں مصائب عشق کا ذکر تو ہے لیکن عاشق کی شناوری ثابت نہیں۔ بس اگر وہ ہمت کرتے ہیں تو اس قدر کہ:

مشو جرعہ کش کیف گرزیست خواھی
کہ زھراست گوئی شراب محبت(۲۰)

یہ اور اس قسم کے دیگر اشعار اس بات کا تو پتہ دیتے ہیں کہ ان کا دل محبت آشنا ہے،

Marfat.com

لیکن یہاں ٹوٹ کر چاہنے اور چاہے جانے کا وہ انداز نہیں جو محبت کا خاصہ ہے۔ یہاں نہ حسد و رقابت کی چنگاریاں ہیں نہ ہجر کی بے تابیاں، نہ وصال کی خواہش۔ ایسے لگتا ہے کہ کیف کی محبت دور کے جلوے ہیں۔ اچھی صورت نظر آئی، دیکھ لیا، خوش ہو گئے۔ ان کی محبت دائمی روگ نہیں جو خون کے آنسو رلوا دے۔ ان کے اضطراب کی وہ کیفیت ہے کہ پانی میں ایک کنکری پھینکی، کچھ لہریں اٹھیں، تھوڑی سی ہلچل پیدا ہوئی۔ پھر دائمی سکوت!

کیف کے یہاں فلسفیانہ مضامین ناپید ہیں۔ البتہ تصوف کی طرف کچھ تھوڑا سا جھکاؤ نظر آتا ہے۔ تصوف میں دو نظریات رائج ہیں۔ "وحدۃ الوجود" یا "ھمہ اوست۔" اور "وحدۃ الشہود" یا "ھمہ از اوست"۔ لیکن یہاں وہ ہست و بود کی گتھیوں میں الجھ کر رہ گئے ہیں:

ھمہ اوست لیک شود نھان چہ کنم شناخت ز یک نشان
کہ کند تعارف آن عیان؟ ھمہ بود ھست ز رنگ و بو(۲۱)
این ہستی گل در نظرم تیرہ نماید
ای جلوۂ پنہان بہ نظر زود عیان شو(۲۲)

پند و اندرز متقدمین شعراء کا خاص انداز ہے۔ حافظ و سعدی کے یہاں تو ایسے مضامین کی بہتات ہے۔ کیف کا انداز بھی کہیں کہیں واعظانہ ہو گیا ہے:

از تلخی ہستی چو بخواہی تو حلاوت
باید کہ نہ ہرگز بہ کسی تلخ زبان شو
یا فتح و یا مرگ بود حاصل ہر رزم
در عرصہ ہستی نہ طلبگار امان شو(۲۳)

زاہد و ریا پرست کی شعراء نے خوب خوب دھجیاں اڑائی ہیں۔ خیام و سعدی نے خرقہ و دلق کو ہدف ملامت بنایا ہے۔ حافظ نے اس سلسلہ میں کوئی مروت نہیں برتی:

من حال دل زاہد با خلق نخواہم گفت
کاین قصہ اگر گویم با چنگ و رباب اولی

کیف بھی اس بات سے متفق ہیں کہ "بادۂ کبر" کی سرشاری کے بالمقابل رندوں کی سرمستی پھر بھلی:

گر ہستی نہ مست از بادۂ کبر
کنی واعظ چہ رندان را ملامت(۲۴)
زاہد خشک، مزن طعنہ بہ عشقم کہ مدام
دیدۂ طمع بہ حوران جنان می داری(۲۵)

Marfat.com

واعظ منم عاصی، چسان دعوای دینداری کنم
جرأت کی دارم بطرز تو ریاکاری کنم (۲۶)

کیف نے بعض حکیمانہ نکتے بھی بیان کیے ہیں۔ عبودیت و بندگی کے لیے ظاہر داری کی ضرورت نہیں۔ جبہ و دستار، مصلیٰ و وضو سے ''عبادت دل بیکس'' بے نیاز ہے:

لازم نہ مصلیٰ ست برائش نہ وضویست
مقبول شود زود نماز دل بیکس (۲۷)

دعوای ھمہ دانی کے باوجود حکماء ''راز دل بیکس'' جاننے سے عاجز ہیں:

حکمای زمان دعوی دانش ھمی دارند
دانند ولی ھیچ نہ راز دل بیکس (۲۸)

دنیا میں دوستی وخلوص ناپید ہے اور بظاہر دشمن کا دوست بن جانا ناممکن ہے لیکن یہ دنیا ناممکن الوقوع ممکنات کی آماجگاہ ہے یہاں کچھ بعید نہیں:

ندیدہ ایم یکی دوست در جہان مخلص
بعید نیست کہ خیزد ز دشمنان مخلص (۲۹)

پیش رووں کی زمین میں سخن آرائی شعراء کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ یہ نہ صرف اپنے کو پرکھنے کا ایک آلہ ہے بلکہ تعلّی کے طور پر کسی حد تک ہم چشمی کا دعویٰ بھی ہے۔ اٹھارھویں صدی کے مشہور شاعر میر غلام علی آزاد بلگرامی (م:۱۷۸۶ء) کی عشقیہ غزل ہے باین مطلع:

دل از خیال مہوشان یک شہر سامان در بغل
این شیشہ باشد دیدنی دارد چراغان در بغل (۳۰)

غالب کے ہم عصر مولوی امام بخش صہبائی (۳۱) (مقتول ۱۸۵۷ء) نے اس بحر و ردیف میں تقریباً اسی رنگ تغزل کو برقرار رکھا ہے۔ مطلع ہے:

دارم دل دیوانہ ای صد داغ حرمان در بغل
چشمی و چندین نسخہ خواب پریشان در بغل (۳۲)

اسی زمین میں ''جانان در بغل'' ''پیکان در بغل'' کے قافیہ و ردیف میں غالب (۱۷۹۷-۱۸۶۸ء) کی عشقیہ غزل بھی قابل ذکر ہے جس کا مقطع ہے:

ہان غالب خلوت نشین بیمی چنان عیشی چنین
جاسوس سلطان در کمین مطلوب سلطان در بغل (۳۳)

کیف نے بھی اس بحر و قافیہ و ردیف میں طبع آزمائی کی ہے اور خوبصورت شعر نکالے ہیں:

Marfat.com

دارم دلی کان نیست جز انبار عصیان در بغل
امید بخشش کو بدین املاک شیطان در بغل
در هر چمن در هر سرا من می روم فغفور سا
در دست یک چوبین عصا یک پارہء نان در بغل
غلطان بسی در خاک و خون طی کردہ ام راہ جنون
پیوست شد تا اندرون خار مغیلان در بغل (۳۴)

طویل و مختصر بحر کا استعمال فارسی کی صف اول و دوم کے شعراء کے یہاں بالکل غیر شعوری طور پر ہوا ہے۔ کبھی کبھی شاعر اسے شاعرانہ مشاقی کی صورت میں بھی برتتا ہے۔ کیف نے اسے پینترے بازی کے لیے استعمال کیا ہے:

سحر چشم تصور بیان۔ چون کنم　　هست نظارۂ دلنشین راست و چپ
عارض مہروش ضوفگن چار سو　　عشوہ نرگس سرگین راست و چپ (۳۵)

مختصر بحر:

روی گل آسا وا کردی
تو محشر برپا کردی (۳۶)

یک نگاہ غلط انداز کنی
قلب را گوئی سرفراز کنی (۳۷)

سادہ بیانی کیف کے کلام کا جوہر ہے۔ انہوں نے صنعتوں کے استعمال سے کلام کو شعوری طور پر بوجھل نہیں کیا ہے۔ البتہ گہگاہ تشبیہات کا برمحل استعمال شعر کی لطافت کو دوبالا کر دیتا ہے:

ببین عرق کہ حیا می دہد نگارم را
بسان لالہ صحرا کہ شستہ شدز گلاب (۳۸)

باکاکل پیچان کن آرایش دل آری
زیور پی وحشی جز زنجیر نمی زیبد (۳۹)

لذت کرب میں دو خمسے کرشن و رام کی توصیف میں کہے گئے ہیں۔ یہاں عقیدت کی سرشاری قدم قدم پر عیاں ہے۔ رباعیات صرف تین ہیں۔ شاید انہیں منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

بحیثیت مجموعی کیف کا کلام اگرچہ مختصر ہے لیکن پختہ ذہن کی نشاندہی کرتا ہے۔ ان کے یہاں فکر و خیال کی وہ گہرائی و گیرائی تو نہیں جو متقدمین کا طرۂ امتیاز ہے۔ نہ سادگی بیان میں وہ پرکاری

Marfat.com

سہل ممتنع کا نام دیا گیا ہے۔ پھر بھی ان کے کلام میں کسی حد تک شبنم کی نرمی اور شعلہ گل کی گرمی کا ایسا امتزاج ضرور ہے جو قاری کے لیے فرحت بخش ہے۔ ویسے بھی یہاں ''چگونگی کلام'' کی اتنی اہمیت نہیں جتنی اہمیت اس بات کی ہے کہ اس زبان میں وہ شخص اظہار خیال کر رہا ہے جو اس زبان کے آداب سے بھی پوری طرح واقف نہیں اور زبان بھی وہ جو آج کی اس نئی نسل کے درمیان اپنی بقاء کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔

حواشی

۱-سرخوش نے انہیں ''خوشگو'' تخلص عطا کیا تھا۔
۲-آزاد بلگرامی نے انہیں شفیق تخلص عطا کیا
۳-بھگوان داس ''بسمل'' اور ''ہندی'' دو تخلص رکھتے تھے۔ ان کے دیوان فارسی ''شوقیہ'' و ''ذوقیہ'' کے نام سے مشہور ہیں۔
۴-مطبوعہ انڈین پریس لمیٹڈ، الہ آباد ۱۹۳۱ء۔
۵-غیر مسلم فارسی شعراء کی نسبت مزید معلومات کے لیے ملاحظہ ہو: ڈاکٹر عبداللہ کی تصنیف فارسی شاعری میں ہندوؤں کا حصہ' جسے حال ہی میں پروفیسر اسلم خاں (دہلی یونیورسٹی) نے فارسی کا قالب عطا کیا ہے۔
۶-اشاعت اول ۱۹۸۸ء
۷-لذت کرب، صفحہ ۵-۶
۸-ایضاً
۹-ایضاً، ص ۱۰
۱۰-ایضاً، ص ۲۳
۱۱-ایضاً، ص ۸
۱۲-ایضاً، ص ۱۶
۱۳-ایضاً، ص ۱۱
۱۴-ایضاً، ص ۲۵
۱۵-ایضاً، ص ۱۶
۱۶-ایضاً، ص ۱۷
۱۷-ایضاً، ص ۹
۱۸-ایضاً، ص ۱۳
۱۹-ایضاً، ص ۱۱
۲۰-ایضاً، ص ۱۳
۲۱-ایضاً، ص ۵۵
۲۲-ایضاً، ص ۵۷
۲۳-ایضاً

Marfat.com

۲۴- ایضاً، ص ۱۶

۲۵- ایضاً، ص ۲۳

۲۶- ایضاً، ص ۵۰

۲۷- ایضاً، ص ۳۲

۲۸- ایضاً

۲۹- ایضاً، ص ۳۵

۳۰- غلام علی آزاد بلگرامی، سرو آزاد، ص ۲۹۶

۳۱- صہبائی نے شیخ علی حزین کے مقابل "قول فیصل" لکھی۔

۳۲- دیوان صہبائی، ص ۱۳

۳۳- کلیات غالب، ص ۲۸۴

۳۴- لذت کرب، ص ۳۶

۳۵- ایضاً، ص ۱۲

۳۶- ایضاً، ص ۶۱

۳۷- ایضاً ص ۲۴

۳۸- ایضاً ص ۱۱

۳۹- ایضاً ص ۲۴

☆☆☆

Marfat.com

خودی روشن ز نور کبریائی است
رسائی ہای او از نارسائی است
جدائی از مقاماتش وصال است
وصالش از مقامات جدائی است

(علامہ اقبال)

Marfat.com

فارسی زبان وادب

Marfat.com

فارسی کا تہذیبی کردار

مثنوی مولانا روم کے حوالے سے

جیلانی کامران ☆

-۱-

علوم شرقیہ کی تدریس اور مطالعے میں جو روایت کارفرما رہی ہے وہ مشرقی علوم کی کلاسیکی تصانیف کو غیر تاریخی تناظر میں پڑھنے اور سمجھنے کی ہے۔ عظیم تصانیف کو اس عہد کے فکری منظر کے حوالے سے بھی درس و تدریس کا موضوع بنایا جاتا ہے اور زیادہ تر اصرار معانی، رموز اور تعلیمات کی آگاہی پر کیا جاتا ہے۔ ایک اعتبار سے یہ درسیاتی روایت، ماضی کے فکری، علمی اور ادبی سلسلے کو عہد حاضر میں منتقل کرتی ہے، اور سود مند ہے۔ تاہم جو وسیع تر پس منظر ان تصانیف کے انسانی شعور اور اس زمانے کے حالات کو متاثر کرتا رہا ہے اس کا تذکرہ نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عالم اسلام کی تاریخ، ماضی میں جن حالات سے نبرد آزما ہوتی رہی ہے ان کے جائزے کے بغیر ان عظیم ادبی کارناموں کا ادراک نامکمل رہتا ہے جن کو اس عہد کی کیفیات میں قلمبند کیا گیا تھا۔

اس ضمن میں ایک دوسرا سوال بھی قابل ذکر ہے کہ کیا زبانیں، ادبیات کی تخلیق میں صرف ذریعہ اظہار کا سبب ہوتی ہیں یا ان کا ادبیات کی تخلیق میں اپنا بھی کوئی متحرک حصہ ہوتا ہے۔ ورجل نے اپنی مشہور نظم ''ای نیئڈ'' (Aeneid) جس زمانے میں لکھی وہ رومی تہذیب کے اواخر کا زمانہ تھا۔ ڈانٹے کی ڈیوائین کامیڈی عیسائی دور اعتقاد کے اولین رویوں کے اختتام پر رونما ہوئی، گوئٹے نے فاوسٹ کو اس وقت لکھا جب یورپی نشاۃ ثانیہ کے بطن سے عقلیت پسندی، ایک نئے جہان کی صورت گری کر رہی تھی۔ اور انسان ایک پریشان کن صورتحال سے دوچار ہونے کو تھا۔ ان کلاسیکی ادبی کارناموں کے مشاہدے سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانے کا مزاج، شاعر کی طبع میں اس اظہار کی پرورش کرتا ہے جو ورجل، ڈانٹے اور گوئٹے کی تصانیف کی شکل میں آشکار ہوا ہے۔ زبانیں اس خاص لمحہ موجود میں اپنے لسانی امکانات کو اس فرض کی تکمیل کے لیے تیار کر چکی تھیں، جو تاریخ نے ان کے لیے متعین کیا تھا۔ اس لیے زبانیں اس فرض کو خوش اسلوبی سے نبھا سکیں جو عظیم تصانیف کی صورت

☆ پروفیسر ایمریطس، گورنمنٹ کالج، لاہور

Marfat.com

میں رونما ہوا اور علمی وفکری سلسلے میں معروضی طور پر شریک ہوا۔

تاہم مغربی تہذیب کے جن شاعروں کی تصانیف کا ذکر ہوا ہے انہیں ایسے سانحے کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا جو عالم مشرق میں اسلامی تہذیب کی راہ میں حائل ہوا تھا۔ علاوہ ازیں اسلامی تہذیب کی تصانیف جس چیلنج سے دوچار ہوئی تھیں ویسا چیلنج نہ تو درجل کے سامنے تھا' نہ ڈانتے کے سامنے تھا اور نہ گوئٹے ہی کے پیش نظر تھا۔ اس لیے عظیم تصانیف کے مطالعے میں اس چیلنج کا شامل کرنا بھی ضروری ہے جو اسلامی تاریخ میں تہذیب کے حوالے سے رونما ہوتا رہا ہے۔ عالم مشرق میں ایسے سیناریو کے حوالے سے مولانا رومؒ کی مثنوی کا تذکرہ ضروری دکھائی دیتا ہے۔

-۲-

عیسوی الف ثانی کے دوران ۱۲۵۸ء کا سانحہ ایک انتہائی المناک واقعہ تھا۔ تیرہویں صدی عیسوی کی ابتداء ہی المناک واقعات سے ہوئی تھی جن کے تاخت و تاراج سے اسلامی تہذیب کا وقار بری طرح مجروح ہوا تھا۔ تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ جو تاخت و تاراج ۱۲۵۸ء اور سقوط بغداد کے نتیجے میں وقوع پذیر ہوئی اس کی مثال شاید کسی اور زمانے میں مشکل سے دکھائی دیتی ہے۔ اس المناک سانحے سے انسانی سرشت پر جو اثرات ہوئے ان کو فراموش کر دیا گیا ہے۔ علامہ اقبال کی رائے ہے کہ اسلامی تہذیب ابھی تک ۱۲۵۸ء کے صدمے سے جانبر نہیں ہو سکی۔ تاریخ جہاں کشا کا مصنف لکھتا ہے کہ خوارزم اور سمرقند و بخارا سے بغداد تک کوئی مدرسہ باقی نہیں رہا تھا۔ لاکھوں انسان ہلاک کر دیے گئے۔ عمارتیں جلا دی گئیں اور ایک اجاڑ اور ویران دشت وحشت' اسلامی تہذیب کے ملبے سے رونما ہوا۔ ایران کی سرزمین پر بھی تاخت و تاراج کا ایسا زمانہ اترا کہ وہاں زندگی کا چہرہ خوف اور سراسیمگی سے پژمردگی کی صورت اختیار کر گیا۔ منگولوں کی یورش اور تباہی نے انسانی سرشت کو بھی پامال کیا اور اس اعتماد کو بھی پاش پاش کر دیا جسے صدیوں کی محنت نے قائم کیا تھا۔ اسلامی تہذیب کا انسان نہ صرف ماحول اور خارج میں ٹوٹا بلکہ اپنے باطن میں بھی ریزہ ریزہ ہو گیا۔ اس انسان کا احیاء اس زمانے کا ایک ایسا مسئلہ تھا جسے کسی بھی طرح معمولی نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم اس کیفیت کو دیکھتے ہوئے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا مولانا روم کی مثنوی کو ایسے پس منظر کے حوالے سے زیر مطالعہ لایا جا سکتا ہے؟

تاخت و تاراج کا ایسا سانحہ تہذیبی شکست و ریخت کا گہرا اور دور رس سبب بنتا ہے۔ متعدد نسلوں کے ہلاک ہو جانے سے ایک طویل خلاء پیدا ہوتا ہے۔ روایات منقطع ہو جاتی

Marfat.com

ہیں۔ قدریں اپنا اثر و رسوخ کھو بیٹھتی ہیں۔ اعتقاد کا دوراہہ ظاہر ہوتا ہے۔ منفی رویے جڑ پکڑتے ہیں اور زندگی پر سے انسان کا اعتبار اٹھ جاتا ہے۔ ایسی صورتحال کا سامنا کرنا ایک کارِمحال نظر آتا ہے کیونکہ اس سانحے کے بعد انسانی سرشت کو بحال کرنا آسان نہیں ہوتا۔ اس کام کے انجام دینے کے لیے طریق کار کی تلاش ایک دشوار مسئلہ بن جاتی ہے اور ٹوٹے ہوئے تہذیبی رشتوں کو مربوط کرنے کے لیے کیسے پیغام کی ضرورت ہوتی ہے' مزید دشوار طلب امور کی نشاندہی کرتا ہے۔ ان دشواریوں کو حل کرنے سے کسی نئی زندگی کی امید ممکن ہوتی ہے۔

-۳-

قیاس ہے کہ مثنوی ۱۲۴۷ء کے بعد معرضِ تحریر میں لائی گئی اور بقول ایم۔ ایم شریف ۱۲۴۷ء ہی میں مولانا روم کے دوست اور مرشد شمس تبریز کی وفات ہوئی تھی۔ ایم ایم شریف نے اس واقعے کو مولانا کی زندگی کا ایک گہرا ذاتی واقعہ قرار دیا ہے جس نے ایک ایسے تجربہ اور واردات کو مولانا روم کی زندگی میں راسخ کیا جو شدید سے شدید تر ہوتا گیا۔ ۱۲۴۷ء میں منگول ابھی بغداد کے راستے میں تھے اور ایران کی سرزمین ان کے تیز رفتار فوجی دستوں کی چاپ سے لرز رہی تھی۔ اس وقت مولانا روم کی عمر چالیس برس تھی۔ سقوط بغداد کے وقت وہ اکیاون سال کے تھے۔ مثنوی کی تحریر کو اس زمانے کے ساتھ منسوب کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مثنوی میں وہی دنیا پس منظر میں جھلملاتی ہے جسے تہذیبی شکست و ریخت نے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ مثنوی اس اعتبار سے دو سانحوں کے بطن سے معرض وجود میں آئی' ایک سانحہ ذاتی نوعیت کا تھا اور شمس تبریز کی وفات سے رونما ہوتا تھا اور دوسرا سانحہ ملی اور انسانی نوعیت کا تھا جس سے عالم اسلام کی کیفیت متعلق تھی۔ نفسیاتی اعتبار سے جو فکری کائنات آشکار ہوئی وہ ذاتی واردات کی صورت میں افقی' اور ملی و انسانی واردات کی صورت میں عمودی تھی۔ اور اس کائنات میں سے گذر کرنے والا قاری افقی اور عمودی جہتوں کے مابین سفر کرتا دکھائی دیتا ہے۔ یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ مولانا روم کی وفات کا سال سن ۱۲۷۳ء ہے۔

-۴-

زبانوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ افکار اور ادب و شعر کے ذریعے ان کا تہذیبی وجود تشکیل پاتا ہے۔ اور یہ تہذیبی وجود کسی بھی بحران کا سامنا کرنے کے لیے ایک معتبر وسیلہ ثابت ہوتا ہے۔ اس لیے اگر سقوط بغداد کے زمانے میں فارسی زبان کا موثر تہذیبی وجود

Marfat.com

دستیاب نہ ہوتا تو جو سانحہ اترا تھا اور جس کے نتیجے میں ایک بہت سنگین انقلاب واقع ہوا تھا اس سے عہدہ برآ ہونے میں بہت دشواری ہوتی۔ سرشت کی پائمالی اور انقطاع کی موجودگی کو فارسی زبان کے تہذیبی وجود نے ایک اثباتی صورت میں بدلنے کی جو تاریخ ساز کامیابی حاصل کی اسے مثنوی میں بخوبی پہچانا جا سکتا ہے۔ ایک عظیم تخلیقی ذہن، زبان کے تہذیبی وجود کو بروئے کار لا کر اپنے عہد کی رستگاری کے لیے جو نمایاں کارکردگی آشکار کرتا ہے اس سے تہذیبوں کی زندگی کے اعلیٰ اور گراں قدر شاہکار معرض تحریر میں آئے ہیں۔ قدیم رومن تہذیب کے انحطاط کے زمانے میں ورجل (وفات ۱۹ ق م) جس لاطینی زبان کو اپنی شہرہ آفاق تصنیف ''ای نیئڈ'' کے لیے بروئے کار لایا وہ اس کے عہد تک پہنچتے ہوئے افکار اور ادبی و شعری روایت کی آبیاری کے باعث باشعور ہو چکی تھی اور تہذیبی وجود حاصل کر چکی تھی۔ ''ای نیئڈ'' اس اعتبار سے زبان کے تہذیبی وجود اور عظیم تخلیقی ذہن کے ارتباط کا ماحصل ہے۔ اس ضمن میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ جہاں ورجل کی نظم ماضی کو اپنے قالب میں سمو لیتی ہے وہیں ایک نئے زمانے کی بشارت بھی دیتی ہے۔ مغربی نقادوں نے ورجل کی نگارشات میں ظہور مسیح کی پیشگوئی کا بھی ذکر کیا ہے اور ایلیٹ نے ''ای نئیڈ'' میں اس زبانی افق کی جانب اشارے بھی ملحوظ نظر گردانے ہیں جن سے نئے زمانے کی آمد کی خبر ملتی ہے جس کے مظاہر تاریخ میں یورپ، مغربی تہذیب اور عہد حاضر کی جدید دنیا کے خدوخال ہیں۔ اس کی رائے ہے کہ لاطینی زبان کے باشعور تہذیبی وجود سے ایسا منظر نامہ ممکن ہوا ہے۔

-۵-

فارسی زبان کا تہذیبی وجود، مولانا روم تک پہنچتے ہوئے تصوف، اصول عشق، تغزل اور ادبی و شعری اسالیب کے زیر اثر باشعور ہو چکا تھا اور یہ تہذیبی وجود برابر موجود تھا جب تاتاریوں کی یلغار ہوئی اور تاخت و تاراج نے انقطاع کے سانحے کو رونما کیا۔ مثنوی میں یہ تہذیبی وجود برابر کارفرما ہے۔ اور حکایات، تمثیلوں اور رموز و اسرار کی توضیح کے ذریعے اور ایک دردمندانہ آواز کے وسیلے سے اپنے عہد کی ملی اور انسانی واردات کی نشاندہی کرتا ہے۔ جس میں انسانی سرشت پائمال ہے، منفی رویے انسان کی فطرت پر گرفت پا چکے ہیں، انسان اپنے خود اعتماد اور باوقار منصب سے گر چکا ہے اور ہجر اور فراق نے ان کی جذباتی زندگی کا محاصرہ کر رکھا ہے۔ زمانہ دشتِ وحشت بن چکا ہے۔ اس میں صرف ایک صدا گونجتی ہے۔ آدم کجاست؟ آدم کجاست؟

جب بھی کسی تہذیب پر ویسا الم ناک سانحہ اترا ہے جیسا ۱۲۵۸ء میں وقوع پذیر ہوا

Marfat.com

تھا اس کے نتیجے میں قلب و ذہن اعلیٰ صداقتوں سے ٹوٹ گئے ہیں۔ اور اعلیٰ صداقتوں کے گم ہو جانے سے انسانوں کی زندگی ادنیٰ صورت اختیار کرتی ہے۔ اور آدم کے قالب سے انسان گم اور حیوان نمایاں ہوتا ہے۔ اندھی تقدیر کا جبر ان کو اور زیادہ زبوں حال کرتا ہے۔ ان کا ہونا نہ ہونے میں بدل جاتا ہے۔ ایسے صبر آزما دور میں یہ سوال اہمیت اختیار کر لیتا ہے کہ انسان کہاں ہے؟ اس انسان کی تلاش اور اس کی نئی تشکیل مولانا روم کی مثنوی کا بنیادی موضوع ہے۔

-۶-

ڈاکٹر نذیر قیصر نے اقبال کے حوالے سے مولانا روم کی مثنوی کا سیر حاصل جائزہ لیتے ہوئے اشارتاً یہ نشاندہی کی ہے کہ مثنوی دورِ فرقت کی روداد بیان کرتی ہے۔ مولانا روم نے المناکیوں کے دشت وحشت کو دورِ فرقت کی تمثیل قرار دیتے ہوئے اس ابتلاء سے رستگاری کو ممکن بنایا ہے۔ مثنوی کا آغاز جس شعر سے ہوتا ہے اس کے اشارے بھی یہی ہیں کہ ''نے'' (بانسری) کی حکایت کو بیان کرتی ہے اور کیا یہ فرقت کی روداد تو نہیں ہے؟ دشت وحشت نے جو شکل اختیار کی تھی اس سے رہائی کا شاید کوئی امکانی ذریعہ نہ تھا' اگر دشت وحشت بدستور حاوی رہتا تو اسلامی تہذیب کے مستقبل کا ماجرا مخدوش ثابت ہو سکتا تھا۔ کیونکہ تاریخ نگاروں کا بیان تھا کہ تاتاری تباہ کاریوں کے نتیجے میں سارے عالمِ اسلام میں علم و حکمت کے چراغ گل ہو چکے تھے۔ مولانا روم نے اس کیفیت کو دورِ فرقت کی تمثیل بنا کر اس رہنما اصول کی تلقین کی کہ دورِ فرقت سے رہائی ممکن ہے' اور فرقت کو اصولِ عشق کی توانائی سے وصل کے مقامات میں بدلا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر نذیر قیصر نے مثنوی کی حکایات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا ہے کہ مولانا روم واقعات کو کسی اندھی تقدیر کی جبریت سے پیدا ہونے والی صورت نہیں گردانتے بلکہ واقعات کو' مشیت الٰہی کے منشاء کا مظہر قرار دیتے ہیں۔ اور اس منشاء کا جاننا اور سمجھنا ضروری ہے۔ اس کیفیت کی ایک صورت یہ ہے کہ واقعات کی جبریت ہی کو قبول کیا جائے اور دوسری یہ کہ واقعات کا منشاء کیا ہے؟ اور واقعات کے اثر سے رہا ہونے کی صورت کیا ہے؟ مثنوی اس دوسری صورت کو لازمی گردانتی ہے۔ ڈاکٹر نذیر قیصر نے مثنوی میں اثبات کے مندرجات کو ایک الگ موضوع گردانا ہے اور نفی کے رویوں کو اس بڑے پس منظر میں سمجھنے کی ضرورت کو محسوس کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دورِ فرقت کا انسان جو مثنوی میں جھلملاتا ہے' اپنے ابتدائی مقام پر نفی کے رویوں میں محصور نظر آتا ہے جسے سرشت کی پائمالی اور انقطاع

Marfat.com

نمایاں کرتے ہیں۔

-۷-

مثنوی جس انسانی کیفیت کو خطاب کرتی ہے اسے قرآنی زبان انسان کے خسارے کی کیفیت بیان کرتی ہے زمانہ جس کی گواہی دیتا ہے۔ اس کیفیت کی ایک بے حد گہری نفسیات ہے جو انسانوں کے شعور کو متاثر کرتی ہے۔ مثنوی میں اس حالت کو مولانا روم آوازِ غول (۱) کے استعارے میں بیان کرتے ہیں۔ جسے شورِ درندگان بھی کہا جا سکتا ہے۔ آوازِ غول اس اعتبار سے محض ایک شعری ترکیب نہیں ہے بلکہ انسانی اعصاب پر ثبت ہونے والے گہرے خوف و ہراس کی تمثیل بھی ہے جہاں خونخوار درندے انسانوں پر حملہ آور ہونے کو ہیں۔ لوگوں کو صبح و شام ان کی آہٹ سنائی دیتی ہے اور وہ بے بسی کے عالم میں بے دست و پا، اپنے عالمِ بے حسی میں کھو جاتے ہیں۔ آوازِ غول کا ہراس ان کا ماحول بنتا ہے اور خوف، رنج و غم، نومیدی، اور بے چارگی ان کے دلوں کو گھیرے رکھتی ہے۔ ایسے منفی رویوں کے تحت ان کی ذہنی توانائی بھی ماؤف ہوئی ہے اور وہ بے کار تقلید کی روش اختیار کر چکے ہیں۔ اپنی آزادی کھو چکے ہیں۔ غلامی ان کا شعار بن چکی ہے۔ ایسی ذہنی اور نفسیاتی رویوں کے ماحول نے ترکِ دنیا کی ترغیب دی ہے۔ اس کیفیت کے اندمال کے لیے مولانا روم تلقین کرتے ہیں کہ یہ سارے رویے ان کی اصل شناخت نہیں ہیں اور اس مسافتِ ذہنی کے باعث ہیں جو ہراسِ درندگان سے پیدا ہوئی ہے۔ اصولِ عشق ایک واحد وسیلہ ہے جو انہیں ہراس اور خوف سے، جو لاشعوری طور پر غوغائے درندگان کے باعث ثبت ہو چکا ہے، نجات دلا سکتا ہے۔

-۸-

جس دورِ فرقت کا ذکر کیا گیا ہے اس میں انسان تنہا ہے اور بے آسرا ہو چکا ہے اور ان رویوں کا شکار ہے جن کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ ایسی صورت عصبی اور ذہنی ہے۔ اس لیے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ایسے انسان کے بچانے کے لیے کون سا طریق کار قابلِ عمل ہے؟ مولانا روم اس ابتلاء سے انسان کے بچنے کے لیے اس الٰہی رحمت کا ذکر کرتے ہیں جو خدا کی صفات رحمٰن اور رحیم میں برابر آشکار ہے اور یہ محبت ہے جو خدا اپنے بندوں سے رکھتا ہے۔ پروفیسر ایم ایم شریف کے مطابق مولانا روم نے عشق کے جس اصول کا ذکر کیا وہ ہمہ گیر ہے اور کائنات کے اندر جاری و ساری ہے۔ کائنات اس الٰہی رحمت کے سبب اپنا وجود رکھتی ہے۔ ایم ایم شریف لکھتے ہیں:

اسلام کا نظریہ عبودیت اس محبت کا اعتراف ہے جو خدا کو اپنے بندوں سے ہے اور صفت رحمٰن اور

۱- مثنوی دفتر دوم، شعر ۱۹۵۷ بحوالہ ڈاکٹر نذیر قیصر

Marfat.com

رحیم میں آشکار ہے۔ خدا محبت میں ہر شے تخلیق کرتا ہے۔ اور ہر شے کو قائم رکھتا ہے۔ وہ اپنی محبت کے طفیل معاف کرتا ہے..... اسلام میں رومی نے محبت کو ایک کائناتی مفہوم دیا۔ بلکہ اسے (عشق) نشوونما کا بنیادی ذریعہ بھی قرار دیا۔ رومی کے مطابق اجرام فلکی کی گردش بھی عشق کے باعث ہے۔ ہر شے کشش عشق کے سبب رونما ہوتی ہے۔ کمتر سے بہتر بنتی ہے اور نمو پذیر ہوتی ہے۔ اگر کائنات میں عشق موجود نہ ہوتا تو کائنات منجمد ہو چکی ہوتی۔ ساری کائنات عشق کی مملکت ہے۔ انسانی شعور عموماً حیاتیاتی سطح تک ہی کارفرما رہتا ہے اور اس کی ساری صلاحیتیں حیاتیاتی ضرورتوں کے تابع رہتی ہیں۔ شعور اس صورت میں خرد کو بروئے کار لاتا ہے جسے رومی عقل جزوی قرار دیتا ہے۔ عقل کلی زندگی کے اس وجدان میں شامل ہوتی ہے جس کا ایک مظہر عشق ہے... انسانوں نے کائنات کی مختلف صورتوں کی پہچان کی ہے۔ تاہم یہ ممکن نہیں کہ بتا سکیں کونسی کائنات میں ان کا اپنا عکس جھلملاتا ہے۔ انسان کی منزل یہ دنیا نہیں ہیں بلکہ وہ گلستان ہے جہاں الٰہی محبت کے ساتھ اس کا وصل ممکن ہوتا ہے۔

مولانا روم نے جہاں عشق کو کائنات کی نشوونما کا اصول قرار دیا وہیں اس خیال کی تکذیب بھی کی کہ دنیا حالات کی قوتوں کا نتیجہ ہے۔ ان قوتوں میں اس قوت کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے جو رستخیز کا باعث بنتی ہے۔ اس لیے جو صورتحال اس عہد میں وارد ہوئی تھی اسے نفسیاتی عارضے سے نسبت دی جا سکتی ہے جس کے زیر اثر زندگی نے ظلمت کی صورت اختیار کی تھی۔ مولانا روم نے حقیقت کی جس طرح توجیہ کی اس نے انسانی فراست کا رخ بدل دیا اور جس المناک مقام نظر سے حالات کی پہچان کی جاتی تھی اس کا اثر زائل ہونے لگا۔ انسان نے اپنی دنیا کو الٰہی رحمت کا ایک مظہر گردانا اور اعتماد پیدا ہوا کہ حالات بدل سکتے ہیں۔ ہراس درندگان سے رہائی پائی جا سکتی ہے۔ عشق کے تصور کے زیر اثر اس عہد نے ایک نیا رخ اختیار کیا۔

-۹-

مثنوی کے تخلیقی مزاج کی پہچان کے لیے یہ امر بھی غور طلب ہے کہ جتنی انسانی جانیں منگولوں کے یلغار میں تہہ تیغ ہوئیں۔ اور صرف ہرات کے شہر میں سولہ لاکھ افراد کو قتل کر دیا گیا تھا اور ان کے مردہ جسموں سے مرقد و مدفن بنائے گئے جو ہر چہار جانب موت کی علامت بن کر پھیل گئے تھے۔ ان کی دہشت سے جو نفسیاتی عارضہ سرایت کر گیا' یہ تھا کہ جسم بے سود ہے' بے کار ہے' اور جسم کی نفی سے روح کی نفی کا خیال شدید ہوتا گیا۔ اگر جسم کوئی شے نہیں ہے تو روح کون سے وسیلے سے کلام کر سکتی ہے؟ اور جسم کو کون سا مفہوم اور معانی فراہم کر سکتی ہے۔ انسانی زندگی سے روح کی گمشدگی اس المناک سانحے کی صبر آزما کیفیت بن کر

Marfat.com

ظاہر ہوئی۔

حقیقت یہ ہے کہ منگولوں کی یلغار سے جو تہذیب زیر و زبر ہوئی تھی وہاں علم و حکمت کے فروغ میں جس تخلیقی سرشت کی کارفرمائی آشکار ہوئی تھی اسے محض انسانی اجسام (اشخاص) کی کارکردگی کہہ کر بیان نہیں کیا جا سکتا۔ تخلیقی سرشت ایک روحانی کیفیت ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سقوط بغداد سے قبل علم و حکمت کے جو دفاتر معرض وجود میں آئے تھے ان میں روح انسانی نے افراد کے وسیلے سے کلام کیا تھا۔ اس لیے وہ سانحہ ایک نئی صورت اختیار کرتا نظر آتا ہے کہ اگر جسم نابود ہو جائیں تو روح بھی گم ہو جاتی ہے۔ مثنوی کے زمانے میں جسم' آبادی کی شکل میں' موجود ضرور تھا مگر روح کا علم انسانی ذہن کی دسترس میں آنے سے قاصر تھا۔ جسم اپنی روح کے تعارف سے محروم ہو چکا تھا۔ مثنوی کا ایک بڑا کردار یہ ہے کہ اس نے روح کو انسانی فراست میں راسخ کیا اور کائنات و زندگی کی جو تشریح کی اسے انسان کے فہم و ادراک کے لیے سود مند بنایا۔

-۱۰-

مثنوی میں جس جہان آگہی کا منظر نامہ ظاہر ہوتا ہے اسے مختلف مقامات نظر کے مطابق دیکھا اور پڑھا جا سکتا ہے۔ تاہم جس سیاق و سباق میں مثنوی کے منظر نامے کا ذکر مطلوب ہے اس میں یہ امر قابل غور ہے کہ مولانا روم نے مادے کو بھی روحانی اساس کا حامل گردانا ہے۔ بقول ایم ایم شریف 'مولانا روم کی نظر میں مادہ اساسی اعتبار سے روحانی ہے اور زندگی مادے سے نمو پذیر ہوتی ہے۔ اس نقطہ نظر نے مادے کے بے جان ہونے کے تصور کی نفی کی' کہ بے جان سے زندگی نمو پاتی ہے۔ مادہ شے ہے اور شے کا وجود کن اور فیکون کے حوالے سے ممکن ہوا ہے۔ مادے کا از خود معرض وجود میں آنا غیر ممکن ہے۔ مادہ صرف حصول علم کا ایک ماخذ ہے اور سائنسی علوم نے اسے مطالعہ کے لیے منتخب کیا ہے۔ مثنوی کے پس منظر میں ان حقائق کو شامل کرنا لازمی ہے۔

اس ضمن میں یہ بھی قابل توجہ ہے کہ سقوط بغداد سے قبل عالم اسلام کی علمی فضا سائنسی علوم کی تھی اور ان کے امکانات روشن تھے۔ معقولات کے میدان میں عالم اسلام نے حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ سقوط بغداد اور اہل علم کی نسل کشی نے علمی سانحے کی کیفیت کو بھی رونما کیا تھا۔ اور جو خلاء پیدا ہوا تھا اسے پر کرنے کے لئے جس مقام نظر کی ضرورت تھی اسے مثنوی نے پورا کیا۔ روحانی شعور کی تلقین اس حصول مقصد کے لیے بنیادی اہمیت کی حامل تھی۔ مادے کی روحانی اساس اس ضمن میں شخصیت کے استحکام کا اولین وسیلہ تھی۔ اس

Marfat.com

سلسلے میں ایم ایم شریف نے مولانا روم کی ایک تمثیل کا ذکر کیا ہے۔ تمثیل یوں ہے:
میں قرنہا قرن خلاء میں گرد و غبار کے ذرات میں سرگرداں رہا۔ بغیر ارادے کے اور بعد ازاں مادے میں منتقل ہوا اور جمادات میں قیام گزیں ہوا۔ نباتات میں ظاہر ہونے کا مقام اس کے بعد مجھے دستیاب ہوا۔ نباتات کے بعد عالم حیوانات میں میرا قیام ہوا۔ اور میرے حافظے سے میرا گل پودے ہونا فراموش ہوگیا۔ تاہم میرے اندر ان کے مانند پھلنے پھولنے کی لگن باقی رہی۔ موسم بہار نے میری لگن کو سرشار کیا جس طرح بچہ اپنی ماں کی طرف دودھ پینے کو لپکتا ہے۔ حیوانیات کے مقام سے مجھے خالق مطلق نے اپنی تخلیقی کشش سے بلند تر کیا اور میں انسان بن کر نمودار ہوا۔ یوں عالم انسانیت میں میرا ذہن فہم و خرد کی منزلوں سے گزرا اور گزرتا رہا اور میں اپنے جسم کو مستحکم کرتا رہا۔ ان منزلوں کی گنتی بے شمار تھی اور اب میں جس مقام پر ہوں اس کے پرے ابھی کئی اور منزلیں ہیں۔ جن تک رسائی پانا ضروری ہے۔ میرا سفر ابھی تک حیاتیاتی تقاضوں اور ذاتی مفادات سے گھرا ہوا ہے۔ لیکن یہ صداقت ہے کہ اس سفر سے ارتقاء کے کتنے ہی اجنبی گوشے آشکار ہونے کو ہیں۔ یہ سارا سفر کتنا حیران کن ہے؟ اور حیرتوں کی حیرت ہے!

(مثنوی، دفتر سوم و چہارم)

ایم ایم شریف نے اس تمثیل کو سراغ ذات کی حکایت قرار دیا ہے جس کے ذریعے شخص اپنی شناخت پاتا ہے۔ تاہم غور طلب یہ ہے کہ میں کا صیغہ واحد متکلم جہاں حیاتیاتی، نباتاتی، حیوانیاتی اور بشری سفر سے گذرا ہے وہاں مقامات قلب و ذہن کے مناظر بھی اس کے ارتقاء میں رونما ہوئے ہیں۔ اس لیے سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ سفر اس واحد متکلم کا محض مادے کے اندر مخفی کسی قوت پیدائی کا ہے یا اسے وہ روحانی کشش پست سے بلند تر کی جانب بلا رہی ہے جو کائنات میں عشق بن کر رواں دواں، اور جاری و ساری ہے۔ مولانا روم کے مطابق اجرام فلکی کے درمیان کشش بھی عشق ہی کی کارگذاری ہے۔ مولانا روم کی میٹا فزکس میں یہ کشش صفت رحمٰن و رحیم کی برکتوں کی رونمائی ہے اور انسان کو مقام حیرت سے روشناس کرتی ہے۔ یہ تمثیل قاری کے حوالے سے خطاب کرتی ہے کہ اے انسان! اپنی پہچان کر، اپنے آپ کو دیکھ اور اس حیرت کو سمجھ جو تجھ میں آشکار ہوئی ہے!

ایک اور مقام پر مولانا روم توجہ دلاتے ہیں کہ زندگی چار عناصر سے ضرور بنی ہے اور آگ، پانی، ہوا اور مٹی کے عناصر اس میں کارفرما ہیں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ان عناصر سے درخت، پھول، پودے، جاندار اور انسان کیسے رونما ہوئے ہیں اور ان عناصر کو دیکھنا ضروری ہے کہ ان سے ذہن، شعور، فہم و ادراک اور عقل کی جلوہ گری کیسے ممکن ہوئی ہے؟ کیا یہ سب کچھ از خود ممکن ہوا ہے؟ کیا خاک سوچ سکتی ہے؟ آگ کے اندر شعور ہے؟ کیا پتھر بے حسی کی ایک صورت نہیں ہے؟ کیا یہ سارا منظر نامہ حکایت عشق نہیں ہے؟ اور خالق کائنات کی محبت

Marfat.com

کا عکس نہیں ہے؟ یہ تمام تر سوال اس سارے منظرنامے کو ایک وسیع و بسیط حیرت کا نظارہ بنا دیتے ہیں۔ مولانا روم کا کہنا ہے کہ جب انسان اس تمام تر نظارے کو اپنے شعور میں قبول کرتا ہے اس وقت اسے جو علم دستیاب ہوتا ہے وہ حیرت انگیزی کا علم ہے اور تحیر کی معرفت بنتا ہے۔ زندگی میں انسان ایک عالم حیرت کے روبرو عمر بسر کرتا ہے۔

-۱۱-

ایم ایم شریف نے مولانا روم کا ذکر اسلامی فلسفے کے ضمن میں کیا ہے لیکن جب وہ اس فلسفے کے بارے میں قطعی بیانات کی طرف رجوع کرتے ہیں تو اس فلسفے میں فہم و خرد کے تصورات نظر نہیں آتے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا روم کا فکری رجحان میٹا فزکس کا ہے جہاں حواس، فہم و خرد اور عقل کے بروئے کار لانے سے اور تخیل کے زیر عمل ایک ایسے جہان آگہی کی خبر ملتی ہے جو حیرتوں کی حیرت بنتا ہے اور انسان کی باطنی زندگی کو شدید انداز میں متاثر کرتا ہے۔ مثنوی کے شعر و فکر کا سارا رخ عالم حیرت کی جانب ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو غوغائے درندگان، عشق اور تغزل و تمثیل و حکایت سے گذرتے ہوئے انسان حیرتوں کی اس حیرت سے آشنا ہوتا ہے جو کائنات کے اندر جھلملاتی ہے۔ اور انسانی دل کو ایک بے خودی، وجد اور استغراق سے فیض یاب کرتی ہے۔ مثنوی اس انسان کی تشکیل کرتی ہے جہاں جسم اور روح کی اکائی صورت پذیر ہوتی ہے۔ مولانا روم نے سقوط بغداد کے المناک سانحے سے رستگاری کا اہتمام کیا اور ایک نئے آدم کے ظہور کی خبر دی! جسے آئندہ کے امکانات کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔

-۱۲-

مثنوی کی تعلیمات نے زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز کیا اور انسانی شخصیت کی تشکیل کے لیے درس و مشاہدے کی روایت قائم کی۔ ان تعلیمات نے فارسی زبان کے ملکوں کو اس خوف و ہراس سے نجات دلائی جس کی المناک کیفیت ۱۲۵۸ء میں رونما ہوئی تھی۔ عالم مشرق کا ذکر کرتے ہوئے تاریخ نگاروں کی ایک رائے یہ رہی ہے کہ جہاں تاتاریوں کی یلغار سے علم و حکمت کے چراغ گل ہو گئے تھے وہاں ایران واحد ملک تھا جہاں یہ شمع برابر روشن رہی اور مثنوی کی تعلیمات کے زیر اثر ملا صدرالدین شیرازی تخلیقی سرشت کی فکری تشکیل کے لیے غور و فکر کو بروئے کار لائے۔ اگر انسانی سرشت کو رستگاری نصیب نہ ہوتی تو ایران کی تہذیبی کارکردگی بھی مختلف ہوتی۔ مثنوی کی میٹا فزکس کے حوالے سے جسے نیا آدم کہا گیا ہے اسے عہد حاضر میں عالم اسلام کا تہذیبی انسان بھی کہا جا سکتا ہے جسے

Marfat.com

اقبال نے جاوید نامہ کی سیاحت میں مولانا روم کی رہنمائی میں سونپا ہے۔ مولانا روم جدید دنیا کی تاریخ میں اس مقام پر دکھائی دیتے ہیں جہاں عالم اسلام اپنی زندگی کے نئے دور میں داخل ہوتا ہے۔ انسان کا بچاؤ دراصل تہذیب کا بچاؤ تھا اور اسے ممکن بنانے کے بعد احیاء اور نشاۃ ثانیہ کی وہ منزلیں رونما ہوئیں جن سے عہد حاضر کی تاریخ گذر رہی ہے۔

حواشی

1-M.M. Sharif,ed., *A History of Muslim Philosophy*, vol.II

2- Nazir Qaiser;*Rumi's Impact on Iqbal's Religious Thought*.

3- T.S.Eliot, *What is a Classic?*

☆☆☆

Marfat.com

فارسی کا اثر بنگالی زبان وادب پر

پروفیسر ام سلمی ☆

برصغیر پاک و ہند کی زبانوں میں بنگلہ ایک اہم زبان ہے۔ بنگلا دیش کے ۹۹ فیصد لوگ اسی زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ (۱) مغربی بنگال کے علاوہ آسام، اڑیسہ اور بہار کے کچھ علاقوں میں بھی یہ زبان مستعمل ہے۔ بنگالی بولنے والوں کو اس بات پر فخر ہے کہ دنیا کی زبانوں میں بنگالی زبان کو آٹھواں درجہ حاصل ہے (۲) اور اس زبان کے مشہور شاعر رابندر ناتھ ٹیگور نے ادب کا بین الاقوامی نوبل انعام پایا۔

بنگلہ زبان سنسکرت سے ماخوذ نہیں۔ بلکہ یہ سنسکرت ہی کی ہم ذات ایک قدیم ہند آریا بول چال کی زبان سے نکل کر بار آور ہوئی ہے۔ یہ قدیم آریائی زبان تدریجی طور پر پراکرت زبان میں مدغم یا تبدیل ہوگئی۔ اسی سے بنگلہ زبان ۷۰۰ء کے لگ بھگ رفتہ رفتہ وجود میں آئی۔ (۳)

فارسی زبان بھی ہند آریائی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اسی لیے فارسی زبان اور بنگلہ زبان میں کئی مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً:

(ا) بنگلہ زبان بھی قدیم فارسی کے خط میخی کے مانند بائیں سے دائیں جانب لکھی جاتی ہے۔

(ب) جملے کی ساخت کے لحاظ سے فارسی اور بنگلہ زبان میں حروف کی ترتیب بھی مساوی ہے۔ جیسے:

تو رفتی (فارسی) - توی گیلی (بنگلہ)

من خوردم (فارسی) - آمی کھائیلام (بنگلہ)

من او را دیدم (فارسی) - آمی تاہاکے دیکھی لام (بنگلہ)

(ج) "فعل" کی حالت میں واحد متکلم اور جمع متکلم کا آخری حرف بھی دونوں زبانوں میں یکساں ہے، جیسے:

کردم (فارسی) - کوریلام (بنگلہ)

کردی (فارسی) - کوریلی (بنگلہ)

☆ استاد شعبہ فارسی و اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش۔

Marfat.com

(د) فارسی افعال میں تذکیر و تانیث کا فرق نہیں ہوتا۔ اس طرح بنگلہ میں بھی فعل کا صیغہ تبدیل نہیں ہوتا' جیسے:

مادر رفت (فارسی) - ماں گیلو (بنگلہ)

پدر رفت (فارسی) - پِتیا گیلو (بنگلہ)

(ر) فارسی میں تذکیر و تانیث کی حالت میں صفات میں کوئی تبدیلی پیش نہیں آتی۔ بنگلہ زبان میں بھی یہی صورت برقرار ہے۔ مثلاً

دخترِ خوشگل (فارسی) - شوندر میئے (بنگلہ)

دختر ہای خوشگل (فارسی) - شوندر میئے را (بنگلہ)

غرض کہ فارسی اور بنگلہ زبان کے رشتے نہایت استوار ہیں اور فارسی زبان کے ساتھ بنگال کے تعلقات نہایت قدیمی ہیں۔ جس کا آغاز ۱۲۰۱ء میں بختیار خلجی کی فتح بنگال سے ہوا۔ خلجی خاندان کے حکمران اگرچہ ترکی نسل کے تھے اور گھروں میں ترکی زبان بولتے تھے مگر سیاسی اور سرکاری کام فارسی زبان میں انجام پاتے تھے' اور مذہبی اغراض کے لیے عربی زبان استعمال ہوتی تھی۔ (۴)

ویسے بھی ترکوں سے پہلے عرب صوفیوں اور درویشوں مثلاً شیخ بایزید بسطامی (متوفی: ۸۷۴ء) شیخ میر سلطان محمد' شیخ محمد سلطان رومی (متوفی: ۱۵۵۳ء) شیخ بابا آدم شہید (متوفی: ۱۱۱۹ء) شیخ نعمت اللہ بدخشان' شیخ احمد تقی (متوفی: ۱۱۶۹ء) وغیرہ (۵) اور تجارت کی غرض سے سوداگروں کی آمد و رفت سے بنگال اسلام اور عربی زبان سے روشناس ہو چکا تھا۔ یہ لوگ بنگال میں آ کر چٹا گانگ اور اس کے گرد و نواح میں بس گئے۔ ان کی زبان زیادہ تر عربی تھی۔ لہٰذا فارسی زبان سے بہت پہلے عربی زبان سے اہل بنگال آشنا ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی چٹا گانگ اور نواکھالی کی مقامی بولیوں میں عربی الفاظ و محاورات کی آمیزش ہے۔ (۶) ان مبلغوں اور درویشوں کی بدولت جو بہت سی عربی مذہبی اصطلاحات بنگلہ زبان میں داخل ہوئیں' وہ آج بھی اسی طرح مستعمل ہیں۔ مثلاً اللہ' رسول' حج' نماز' روزہ' زکوۃ' رکعت' رکوع' سجدہ' کافر' مومن' بندہ' بہشت' دوزخ' قربانی' مسجد' مؤذن' اذان' اعتکاف' تہجد' جہاد' کعبہ' قبلہ' زیارت' مرشد' کامل وغیرہ۔

ترکوں کی آمد کے بعد مسلمانوں کی حالت بنگال میں مزید مستحکم ہوگئی۔ مسلمان جرنیلوں نے نئے نئے علاقے فتح کیے اور صوفیوں اور درویشوں نے زور شور سے تبلیغ جاری رکھی۔ ان

Marfat.com

مبلغوں کی زبانیں فارسی اور عربی تھیں۔ ترکوں کی فتح بنگال کے بعد غیر ملکوں سے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد بنگال آنے لگی۔ ان میں سے کچھ تو قسمت آزمانے آتے تھے' کچھ تجارت کے سلسلے میں اور کچھ اپنے ملکوں سے بھاگ کر پناہ لینے کے لیے۔ بختیار اور اس کے جرنیلوں کے ساتھ آئے ہوئے سپاہی یا تو غیر شادی شدہ تھے یا بیویاں ساتھ نہ لائے تھے۔ انہوں نے نیز بہت سے دوسرے مسلمانوں نے بنگال میں شادیاں کرلیں اور یہیں کے ہو رہے۔ تھوڑے ہی عرصے بعد فارسی اور عربی بولنے والے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد بنگال کی ایک تہذیبی قوت بن گئی۔ (۸) اس بارے میں نریندر اناتھ لا کہتے ہیں:

The Mohammadan invasions of India marked the beginnings of momentous changes not only in the social and political spheres but also in the domain of education and learning[8]

اس زمانے میں کچھ عربی فارسی تصنیف کا کام بھی ہوا۔ علی مردان خلجی (۱۲۱۳-۱۲۱۰ء) کے عہد میں سمرقند کے قاضی رکن الدین لکھنوتی میں مقیم تھے۔ انہوں نے اس زمانے کے نامور ہندو جوگی بھوجن برہمن کی سنسکرت کتاب امرت اخوند کا فارسی اور عربی زبان میں ترجمہ کیا۔ (۹)

سلطان شمس الدین الیاس شاہ کے عروج (۱۳۴۲ء) کے ساتھ بنگال میں ترکوں کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور الیاس شاہی دور حکومت کا آغاز ہوا۔ اس دور میں بھی فارسی دربار کی زبان تھی۔ ہندو اور مسلمان دونوں یہ زبان پڑھا کرتے۔ بعض تو محض اس وجہ سے کہ یہ درباری زبان تھی لیکن بہت سے اس لیے کہ مسلمانوں کے کلچر کو سمجھ سکیں۔ چنڈی چتنیا منگل سے ہمیں ملک کے ہندوؤں پر مسلمانوں کے رہن سہن اور فارسی آداب کے بتدریج اثرات کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ وہ ہندوؤں کے آداب کا نقشہ یوں کھینچتا ہے:

برہمن داڑھی رکھتا ہے' فارسی پڑھتا ہے۔ موزے پہنتا ہے۔ ایک ہاتھ میں لکڑی دوسرے میں کمان رکھتا ہے اور مثنوی بھی سناتا ہے۔ (۱۰)

یعنی قدرتی طور پر ہندو بھی فارسی ادب اور زبان سے متاثر تھے۔ الیاس شاہی دور میں اس خاندان کے بادشاہ رکن الدین مبارک شاہ (۱۴۷۴-۱۴۵۹ء) کے زمانے میں ابراہیم قوام فاروقی نے مشہور فارسی لغت فرہنگ ابراہیمی کی تدوین کی۔ جو شرف نامہ کے نام سے بھی مشہور ہے۔ اس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اس عہد میں بنگال میں امیر زین الدین ہروی' امیر شہاب الدین حکیم کرمانی' منصور شیرازی' ملک یوسف' سید جلال' سید رکن' شیخ واحدی اور امیر ضیاالدین ہروی' جیسے فارسی شعراء دربار سے منسلک تھے۔

Marfat.com

۱۴۸۷ء میں الیاس شاہی خاندان کا خاتمہ ہوا۔ شاہزادہ باربک نے حبشی سلاطین کے سلسلے کی بنیاد رکھی۔ اس خاندان کا آخری بادشاہ شمس الدین مظفر شاہ اپنے ظلم اور بربریت کی بنا پر ۱۴۹۳ء میں قتل ہو گیا اور سلطان علاء الدین حسین شاہ نے حسین شاہی خاندان کی بنیاد ڈالی۔ اغلب یہ ہے کہ حبشی سلاطین اپنے عہد کی افراتفری کے باعث کوئی ادیبانہ سرپرستی نہ کر سکے۔ (۱۱)

۱۴۹۳ء سے لے کر ۱۵۳۸ء تک بنگال حسین شاہی خاندان کے تحت رہا۔ اس خاندان کے پہلے بادشاہ علاء الدین کے دربار کی زبان بھی فارسی ہی تھی۔ ایس ایم اکرام کہتے ہیں:

But the Court language of Alauddin Husain Shah was Persian,and though he, like many other Muslim kings, patronized writers in regional language, his primary interest was Persian and Arabic.(۱۲)

چنانچہ حسین شاہی دور میں فارسی بنگال کی مقبول زبان تھی۔ پندرھویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں فارسی زبان کے قومی اثرات کا ذکر کرتے ہوئے چینی سیاح مہوان نے اپنے سفرنامے میں فارسی کی مقبولیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ الیاس شاہی دور میں بنگال دہلی سے خودمختار ہو گیا' مگر اس سے فارسی کی حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ اس زمانے کے تمام خطابات بھی فارسی زبان ہی میں رہے جیسے شراب دار' ساقی خاص' وکیل دار' امیر حاجب' نقیب' نائب خان اعظم' خاقان معظم' منصب دار' کارفرما' کاتب' دیوان' کوتوال' منصف' وزیر لشکر' سرلشکر' سرخیل' سپہ سالار' مجموعہ دار' جاگیردار' زمین دار' تعلق دار' سکہ دار وغیرہ۔ (۱۳)

عدالت کی زبان بھی فارسی تھی اور عدالتی کاروائیاں بھی اسی زبان میں طے پاتی تھیں۔ علاوہ ازیں بہت سی آئینی اصطلاحات بھی اس طرح زبان زدعام ہو گئی تھیں کہ وہ آج بھی بنگلہ زبان کا حصہ ہیں۔ جیسے پیش کار' دستخط' آئین' آئین نامہ' قانون وغیرہ۔

اس زمانے میں اکثر کتبے بھی فارسی زبان میں لکھے جاتے تھے۔ اگرچہ اس سے قبل کتبے عربی زبان میں کندہ کیے جاتے تھے۔ اس خاندان کے حکمرانوں نے اکثر شاہی فرمان فارسی زبان میں جاری کیے۔ حسین شاہ کی کان پور اور سلہٹ فتح کے موقع پر سلہٹ کے علاقے سے اس عہد کے جو کتبے دستیاب ہوئے ہیں وہ فارسی زبان ہی میں ہیں۔ (۱۴)

اس خاندان کے امراء اور حکام علم و ادب کے بھی شائق تھے۔ وہ نامی گرامی علماء اور شعراء کو اپنے درباروں کی زینت سمجھتے تھے۔ (۱۵) چنانچہ غیاث الدین اعظم شاہ (۱۵۳۸-۱۵۳۲)

Marfat.com

نے حافظ شیرازی کو بنگال آنے کی دعوت دی۔ حافظ خود تو نہ آئے لیکن یادگار کے طور پر غزل لکھ کر بھیج دی اور بنگالہ قافیے میں لا کر شعر کے ساتھ نام کو بھی غیر فانی بنا دیا۔ متعلقہ اشعار یہ ہیں۔

ساقی حدیث سرو و گل ، لالہ می رود
این بحث با ثلاثہ غسالہ می رود
شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند
زین قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود
حافظ زشوق مجلس سلطان غیاث الدین
خامش مشو کہ کار تو از نالہ می رود

اس دور میں بنگلہ زبان پر فارسی کے اثرات کا اندازہ شیخ نور قطب عالم پانڈوی کے اشعار سے بھی ہوتا ہے۔ نور قطب عالم غیاث الدین کے ہم عصر و ہم درس تھے۔ (۱۶) ان کے اشعار کی زبان آدھی بنگلہ اور آدھی فارسی ہے اور ایسی ہی زبان عوام میں رائج تھی۔ جیسے:

وہ چہ کردم روی تو دیدم امت پاگل بھیلوں
شب نخفتم روز نخوردم کتیک بوجھسی تورے
گرتو بیایی زندہ شوم سیس دھروں تور پائے
میل محبت از سرجویم تجھ بن جاؤں تور نائے
طاقت صبر نماند قطب کتیک دکھ سیہوں
درھر موی سوز دارم اینک پوڑی مرون (۱۷)

اگرچہ الیاس شاہی دور میں بنگال میں کوئی قابل ذکر فارسی تصنیف نہیں ملتی مگر پورے بنگال میں فارسی کا ایسا بول بالا تھا کہ بنگلہ زبان لکھنے والے شعراء و ادباء نے اس کے لفظی و معنوی سرمایوں سے پورا فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ اس عہد کے مشہور شاعر شاہ محمد صغیر نے جامی کی یوسف زلیخا کو بنگلہ زبان میں منتقل کیا۔ انہوں نے فردوسی سے بھی کچھ اثر لیا ہے۔ دونا غازی نے سیف الملوک بدیع الجمال کا بنگلہ ترجمہ کیا۔ دولت وزیر بہرام خان نے ۱۵۷۵ء میں لیلیٰ مجنون لکھی جو جامی کی لیلیٰ مجنون کا آزاد ترجمہ ہے۔ محمد کبیر نے ۱۵۸۸ء میں مدھو مالتی لکھی۔ شاعر نے صاف صاف اقرار کیا ہے کہ انہوں نے اس میں فارسی بحور کا استعمال کیا ہے۔ شیخ فیض اللہ نے فارسی مرثیوں کی مانند بنگلہ

Marfat.com

میں زینبیر چو یشا ایک نوحہ لکھا جس میں محرم کے المیے کے بعد حضرت زینبؑ کے نوحہ کا بیان ہے۔ چاند قاضی نے اپنی غزلیات میں اکثر مقامی چیزوں کو بانسری کے استعارہ کے ساتھ سمو دیا ہے جسے مولانا جلال الدین رومی نے بھی اپنی مثنوی میں استعمال کیا اور جو فارسی صوفی شاعروں کی غزلیات کی یاد دلاتا ہے۔(۱۸)

بنگال میں مغلیہ حکومت کے ۱۸۰ سالہ قیام نے فارسی زبان وادب کی نشو ونما میں دیرپا اثرات چھوڑے۔ اس عہد میں فارسی کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ اگرچہ مغلوں سے پہلے بھی فارسی دربار کی زبان تھی لیکن فارسی زبان سکہ جات اور کتبات کے سلسلہ میں شاذ و نادر ہی استعمال ہوتی تھی۔ عربی اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کی زبان تھی۔ فارسی دربار کی زبان تھی۔ روزمرہ کی بول چال بنگلہ میں ہوتی تھی۔ ہندوؤں کو سنسکرت سے زیادہ لگاؤ تھا۔
لیکن مغل عہد میں نہ صرف دربار بلکہ معاشرہ کے ہر حصہ میں فارسی زبان کا سکہ رواں تھا۔ مغل عہد کے بعد سے شاید ہی کوئی کتبہ عربی زبان میں لکھا گیا ہو۔ فارسی متمدن طبقہ کی زبان تھی۔ مسجدوں اور سکہ جات پر اسی زبان میں عبارتیں درج ہوتی تھیں۔ یہی زبان دربار میں بولی جاتی تھی۔ مال گذاری وغیرہ کے کاغذات بھی اسی میں مرتب ہوتے تھے۔ کسی شخص کے معاشرتی اور تعلیمی معیار کی کسوٹی اس کی فارسی دانی ہی تصور ہوتی تھی۔ سرکاری ملازمت کے لیے فارسی زبان بہترین سفارش تھی۔ ان حالات میں بنگال کے لوگوں کا فارسی زبان وادب سے متاثر ہونا ایک قدرتی امر تھا۔(۱۹)

بنگلہ زبان میں فارسی کے بہت سے الفاظ اس طرح داخل ہو گئے کہ انہوں نے بنگلہ زبان کی لغت ہی کو تبدیل کر دیا۔ جیسے بنگلہ لفظ (راجشو) کی جگہ خزانہ (پرجا) کی جگہ رعیت' (موہا پاترو) وزیر بن گیا (نیشا پوتی) ''کوتوال'' (دہرمادھیکار) ''قاضی'' (بھریتو) 'نفیر'' (دوشی بیکتی) ''آسامی'' (ابھی جوگکاری) ''فریادی'' (بیچارا لوئیے) ''عدالت'' (راج شوبھا) ''دربار'' (پروبھو) ''حضور'' (داس) 'خدمت گار اور اسی طرح کے سینکڑوں الفاظ نے بنگلہ زبان کے الفاظ کی جگہ لے لی۔(۲۰)

بہت سے فارسی سابقے اور لاحقے بنگالی الفاظ میں شامل ہو کر نئے الفاظ کی تشکیل میں مددگار بنے۔ جیسے:

فارسی انداز سے (تیرانداز)

فارسی باز سے (پھانکی باز)

Marfat.com

فارسی پاش سے (گلاب پاش)
فارسی خانہ سے (دوا خانہ)
فارسی زاد سے (بدذات)
فارسی نویس سے (نقل نویس) وغیرہ (۲۱)

بہت سے فارسی محاورات بھی بنگلہ زبان میں داخل ہو گئے ہیں' جیسے فارسی نمک خوردن بنگلہ میں ''نمکا کھاوا'' ''زمین خوردن'' بنگلہ میں ''اچھاڑ کھاوا'' ''لگد خوردن'' بنگلہ میں ''لاتھی کھاوا''۔ فارسی کے یہ محاورات بنگلہ میں انہی معنوں میں مستعمل ہیں۔ ان کے علاوہ مشروب خوردن ''شربت کھاوا''، شیر خوردن بنگلہ میں دودھ کھاوا' آب خوردن بنگلہ میں ''تانی کھاوا''۔ بنگلہ زبان میں بھی ''پینا'' کے لیے کھانا مصدر ہی استعمال ہوتا ہے۔

بہت سے بنگالی مرکبات فارسی مرکبات کا ہو بہو ترجمہ معلوم ہوتے ہیں جیسے بنگلہ مرکبات ''چاند بدن'' ''چاند موکھ'' فارسی مرکبات ''ماہ رو'' ''ماہ رخ'' ''ماہ لقا'' ''ماہ طلعت'' کا ترجمہ معلوم ہوتے ہیں۔ ''گگن چومبی'' ''فلک بوس'' کا گگن سپرشو' فلک سائی پوشپو گچھو' فارسی گلدستہ کا ''جل دھار'' آبدار کا ترجمہ معلوم ہوتے ہیں۔

بہت سے مرکبات ایسے ہیں جو بنگلہ زبان میں بھی انہی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں جیسا کہ فارسی زبان میں۔ جیسا کہ نمک حرام' پردہ نشین' دربان' پروردگار وغیرہ۔ (۲۲)

اس کے علاوہ روزمرہ کی اشیائے ضرورت' مذہبی' علمی' اقتصادی' معاشی' آرائشی' سماجی اور اسی طرح کے بہت سے دوسرے الفاظ بھی بنگلہ میں داخل ہو گئے ہیں۔ ان الفاظ کا صحیح اندازہ لگانا تو مشکل ہے مگر تقریباً چھ ہزار فارسی الفاظ بنگلہ زبان پر براجمان ہیں۔ (۲۳)

فارسی الفاظ کے اس وافر خزانے نے بنگلہ میں داخل ہو کر اس زبان کو ایک نیا روپ عطا کیا یعنی دو بھاشی' بنگلہ وجود میں آئی۔ یعنی ایسی بنگلہ زبان جس میں فارسی الفاظ بکثرت مستعمل تھے۔ جو لوگ دفتر یا عدالتوں میں کام کرتے یا تجارت کرتے تھے وہ باہمی گفتگو میں عربی و فارسی سے مخلوط بنگلہ ہی استعمال کرتے۔ یہی زبان ادب میں بھی قبولیت عوام کی خاطر داخل ہو گئی۔ اسی زمانے میں وہی لوگ معزز زبان بولتے تھے جو بنگلہ افعال کے ساتھ فارسی و عربی اسماء زیادہ تر مخلوط کرتے تھے۔ (۲۴)

الفاظ کے علاوہ موضوعات پر بھی فارسی کا گہرا اثر پڑا۔ اس زمانے میں معاشرے میں فارسی و عربی کا اثر اتنا زیادہ تھا کہ شعراء و ادباء کو بنگلہ زبان میں اسلامی موضوعات پر لکھنے

Marfat.com

میں دقتیں پیش آتی تھیں' کیونکہ اس زمانے تک اسلامی موضوعات پر کتب فارسی وعربی زبان ہی میں تھیں۔ اس عہد میں قدامت پسند طبقے نے ایک تحریک شروع کر رکھی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوؤں کی زبان (بنگلہ) میں اسلام کی باتیں نہ بیان کی جائیں۔ اسی لیے بنگلہ شاعر سید سلطان کو ''فریبی'' اور ''سیاہ کار'' کے طعنے سننے پڑے۔ شاعر عبدالحکیم نے اس تحریک کی مخالفت کرتے ہوئے ایک بنگلہ نظم میں اپنے مخالفوں سے یوں خطاب کیا ہے:

میں بنگلہ زبان میں لکھتا رہتا ہوں
میری کوشش یہ ہے کہ محنت کر کے سب کو خوش کروں
مجھے عربی فارسی سے بیر نہیں
کیونکہ لوگ تو مقامی بولی ہی سمجھتے ہیں
کوئی بات عربی' فارسی یا ہندی میں کہی جائے تو مضمون میں فرق نہیں آ جاتا
بالخصوص جب وہ بات خدا اور اس کے رسول (ص) کے مناقب سے متعلق ہو
خدا اپنے بندوں کی بولی سمجھتا ہے
وہ ہندوؤں کی زبان سے بھی واقف ہے۔
اور بنگالیوں کی زبان بھی سمجھتا ہے۔
مجھے ان لوگوں کی ولدیت میں شبہ ہوتا ہے
جو پیدا تو بنگال میں ہوئے اور بنگلہ زبان سے نفرت کرتے ہیں
اگر وہ مقامی زبان نہیں سیکھنا چاہتے
تو وہ کیوں نہیں اس ملک کو چھوڑ کر کسی دوسرے دیس میں چلے جاتے؟
ان کے والدین اور آباء و اجداد بنگال میں رہے
یقیناً بنگلہ زبان میں تبلیغ کا اخلاقی اثر زیادہ ہوتا ہے۔ (۲۵)

اس عہد میں مروجہ تین زبانوں فارسی' عربی اور بنگلہ کے متعلق رائے زنی کرتے ہوئے شاعر عبدالحکیم کہتے ہیں:

جس شخص کو ان تینوں زبانوں میں سے کوئی بھی نہیں آتی وہ یقیناً اندھیرے میں ہے۔
اولاد آدم کے لیے ضروری ہے کہ وہ علم حاصل کرے۔
کیونکہ علم کے بغیر مالک حقیقی کو نہیں پہچانا جا سکتا۔

بہر حال ان حالات کے باوجود مغلیہ عہد میں بنگلہ زبان میں فقہ اسلامی پر بہت سی تصانیف وجود میں آئیں جو بیشتر فارسی و عربی سے ماخوذ نظر آتی ہیں۔ جیسے نصیحت نامہ از شیخ پران' موسار سوال و شریعت نامہ از نصر اللہ خان' کفایت المصلین از شیخ

Marfat.com

مطلب' نصیحت نامہ از عبدالحکیم' نوازش خان کی بیانات' محمد فصیح کی مناجات' محمد خان کی فوائد نماز' اور ہدایت العوام از حیات محمود۔ (۲۶)

عہد مغلیہ میں ایران اور دیگر علاقوں سے شیعہ حضرات کے بنگال میں آباد ہونے اور وہاں شیعہ مسلک کے پھیلنے کی وجہ سے مرثیہ لکھنے کا رواج بھی شروع ہوا۔ اس سے قبل بنگالی ادب میں مرثیے قطعاً مفقود تھے۔ اگرچہ شیخ فیض اللہ کا زینبر چوتیشا اس قسم کے ادب کی ایک مثال ہے لیکن یہ محض ایک ماتمی نظم ہے جس میں افسانوی عنصر کا فقدان ہے۔ اس عہد کے بعض مرثیوں کے نام یہ ہیں: مقتول حسین جس کے لکھنے والے محمد خان ہیں' کاروالا عبدالحکیم نے قلم بند کی۔ غریب اللہ اور یعقوب نے بھی مقتول حسین نظم بند کی ہے اور محرم پروا حیات محمود کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ (۲۷)

اسلامی موضوعات کے ساتھ تصوف پر بھی بنگلہ میں کتابیں لکھی گئیں۔ صوفیانہ خیالات بھی فارسی ہی کی وساطت سے بنگلہ میں داخل ہوئے۔ پھر ہندو یوگی طریقے بھی ان میں خلط ملط ہو گئے۔ اس اختلاط سے جو ادب وجود میں آیا اسے یوگ قلندر ادب کا نام دیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ کی چند اہم کتابوں کے نام یہ ہیں: جیون چوتیشا اور جیون پرادیپ از سید سلطان' دور جمال از حاجی محمد' سر نامہ از شیخ منصور' لوگ قلندر از سید مرتضیٰ' مقام بھید از عبدالحکیم۔ (۲۸)

بنگلہ کے رومانی قصوں پر بھی فارسی کا اثر پڑا۔ مسلمانوں نے بنگالی میں نہایت عمدہ افسانے لکھے۔ یہ رومانی قصے غالباً فارسی عشقیہ افسانوں کے لطیف اور فن کارانہ طرز ادا سے متاثر ہیں۔ اسی لیے ان میں حسن و نزاکت پائی جاتی ہے۔ ان میں قابل ذکر کتابیں یہ ہیں: عبدالحکیم کی یوسف زلیخا اور لال متی سیف الملوک' نوازش خان کی گل بکاؤلی' منگل چاند کی مدھو بالا' یوسف زلیخا از غریب اللہ اور یعقوب اور گدا ملکہ از شیخ سعدی وغیرہ۔ (۲۹)

۱۷۵۷ء میں پلاسی کے میدان میں انگریزوں کے ہاتھوں نواب سراج الدولہ کی شکست کے بعد بنگال آہستہ آہستہ مغل اقتدار سے باہر نکل گیا' اور برطانوی عملداری میں شامل ہو گیا مگر اس سے فارسی کی مقبولیت پر کوئی اثر نہ پڑا' بلکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکام اعلیٰ نے فارسی کی سرپرستی ہی کی۔ فارسی سیکھنے والوں کو سال اول کے دوران دو سو روپے ماہوار اور

Marfat.com

سال دوم میں ماہانہ تین سو روپے کا مخصوص وظیفہ دیا جاتا تھا۔اس سلسلے میں ۶ ستمبر ۱۷۷۰ء میں سب سیکرٹری J.L.Chauvet کی زیر صدارت ایک قرارداد پاس ہوئی۔ اپریل ۱۷۷۵ء میں نئے سب سیکریٹری C.Shakespear نے پھر اس قرارداد کی تصدیق کی۔ ۱۷۷۸ء میں Charles Wilkins نے فارسی اور اردو ٹائپ مشین ڈیزائن کی۔ انہوں نے ۱۷۷۸ء ہی میں ہوگلی سے ایک فارسی گرامر بھی شائع کروائی۔(۳۰)

انگریزی عہد میں کلکتہ میں فارسی اپنے پورے عروج پر تھی۔ اس زمانے میں کئی انگریز فارسی ادب سے دلچسپی رکھتے تھے۔ جن میں فورٹ ولیم کالج میں بنگلہ زبان کے پروفیسر ولیم کیری قابل ذکر ہیں۔

۲۰ فروری ۱۸۲۸ء کو اردو کے مشہور شاعر مرزا غالب اپنی پنشن کی بازیابی کے لیے کلکتہ پہنچے۔ انہوں نے کلکتہ میں فارسی کی جو بہار دیکھی تو اردو شعر گوئی کی طرف اپنا رجحان کم کر کے فارسی کی جانب زیادہ مائل ہو گئے۔(۳۱)

اس عہد میں بنگال میں فارسی صوفیانہ خیالات سے متاثر لالن شاہ (۱۸۹۰-۱۷۷۴ء) کو بنگال کا رومی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ کیونکہ لالن شاہ اپنے خیالات میں رومی سے بہت متاثر ہیں۔رومی کی طرح لالن شاہ بھی اس خیال کے قائل ہیں کہ جب تک فنا کا مرتبہ حاصل نہ ہو عشق اور محبت الٰہی ناتمام ہے۔ چنانچہ لالن شاہ فرماتے ہیں:

جو درحقیقت درویش ہیں
وہ خود کو فنا کر کے ذات مطلق میں ضم کر دیتے ہیں۔
اے دل! تو اگر فقیر ہے
تو فنا کی حقیقت جان لے
فنا کی حقیقت معلوم نہ ہو
تو یہ دم بھرنا بیکار ہے۔

مگر فنا کی نسبت ''بقا'' کی کیفیت رومی اور لالن دونوں کے ہاں زیادہ غالب ہے۔ان کے کلام میں وہ جلال کبریائی اور بلند آہنگی کے عناصر بھی اسی وجہ سے نظر آتے ہیں جو عام صوفیا کے ہاں نظر نہیں آتے۔ جہاں رومی حالت بقا میں یہ سناتے ہیں۔

بہ زیر کنگرہ کبریاش مردانند
فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر

Marfat.com

وہاں لالن اپنے زورِ عشق کا اظہار یوں کرتے ہیں:

جو اللہ کا عاشق ہوتا ہے وہ اپنے زورِ عشق سے آسمان کا تیر (یعنی عطارد) زمین پر اتار لیتا ہے۔(۳۳)

تیرھویں صدی سے لے کر اٹھارھویں صدی تک برصغیر میں فارسی کا پورا عروج تھا۔ لیکن اٹھارھویں صدی کا خاتمہ ہوتے ہوتے تاریخ نے ایک کروٹ بدلی۔ مغل سلطنت کی کمزوری کے باعث نئی طاقتیں نئے راج محل کھڑے کر رہی تھیں۔ اس دور کے اندر ایک بدیسی طاقت تجارت کی راہ سے دیس پر چھا گئی۔(۳۴)

انگریز جو برصغیر کے حکمران بن گئے وہ بھی فارسی پڑھتے تھے کیونکہ مسلمانوں کی فتح بنگال کے بعد وہی سرکاری زبان تھی۔ مگر بعد ازاں حکومت انگریز نے ایکٹ نمبر ۲۹ مجریہ ۱۸۳۷ ایک قانون جاری کیا جس کی رو سے فارسی کو ہمیشہ کے لیے دیوانی اور فوجداری عدالتوں سے خارج کر دیا گیا اور اس کی جگہ علاقائی زبانوں کو دے دی گئی۔ وہ فرمان حسب ذیل تھا:

It is hereby enacted, that from the First Day of December 1837, it shall be lawful for the Governor-General of India in Council, by an order in Council, to dispense, either generally, or within such local limits as may to him meet, with any provision of any Regulation of the Bengal Code which enjoins the use of the Persian language in any judicial proceeding, or in any proceeding relating to the Revenue and to prescribe the language and character to be used in such proceedings. (35)

بنگال کے مسلمانوں نے اس قانون کی پرزور مخالفت کی۔ چنانچہ ۱۸۳۹ء میں ایک عرضی مشرقی بنگال سے احتجاج کے طور پر بھیجی گئی جس پر ڈھاکہ کے چار سو اکاسی تعلیم یافتہ لوگوں کے دستخط تھے۔ جن میں سے ایک سو ننانوے ہندو تھے۔ یہ عرضی اس وقت کے جج مسٹر جے۔ ایف۔ کوک نے حکومت بنگال کے سکریٹری کو بھیج دی مگر اس سے کوئی بڑا فائدہ برآمد نہ ہوا۔ بالآخر فارسی اپنی حیثیت کھو بیٹھی اور بنگال میں بنگلہ زبان کو مزید ترقی کرنے کے مواقع مل گئے۔(۳۶)

برطانوی عہد میں ہندوؤں کے ہاتھوں جدید بنگلہ ادب کی داغ بیل پڑی۔ مدت دراز تک اس پر ہندوؤں کا غلبہ رہا۔ انہوں نے جدید بنگلہ سے عربی و فارسی الفاظ کو نکال باہر کرنے کی کوشش تو کی مگر ان کی ملاحت و حلاوت اور جوش و جذبہ سے مرعوب ہو کر وہ بھی غیر ارادی طور پر گاہے گاہے ان کا استعمال کیے بغیر نہ رہ سکے۔ جدید بنگلہ ادب میں ہندو شاعروں اور

Marfat.com

ادیبوں کا اثر دیکھنا ہو تو گریش چندر، ستین درناتھ اور موہت رائے وغیرہ کی تحریروں پر نظر ڈالنی چاہیے۔(۳۷)

گریش چندر سین (۱۹۱۰-۱۸۳۴) نے سب سے پہلے بنگلہ زبان میں قرآن پاک کا مکمل ترجمہ پیش کیا۔ اس کے بعد حدیث کی مشہور کتاب مشکوٰۃ شریف کا نصف سے زائد ترجمہ کیا۔ گریش چندر نے فریدالدین عطار کے تذکرۃ الاولیاء کے تتبع میں ایک بنگلہ کتاب تاپش مالا لکھی۔ اس کے علاوہ گریش چندر سین نے دیوان حافظ، گلستان، مکتوبات مخدوم شرف الدین منیری، مثنوی رومی، منطق الطیر، کیمیائے سعادت، گلشن اسرار کے جستہ جستہ تراجم بھی کیے۔(۳۸)

ستین درناتھ دور جدید میں سب سے پہلے بنگالی شاعر ہیں جنہوں نے عربی، فارسی اور اردو کے بے شمار الفاظ کو بنگلہ ادب میں سمویا۔ انہوں نے بعض آیات قرآنی، احادیث رسولؐ، فارسی منظومات کے تراجم بھی بنگلہ میں پیش کیے۔ ان کے مجموعہ تراجم کا نام تیرتھو شلیل ہے۔(۳۹)

موہت لال مجمدار کی شہرت کا خاص سبب یہ ہے کہ انہوں نے نذرالاسلام سے پہلے فارسی و عربی خیالات سے بنگلہ ادب کو مالا مال کیا اور فارسی الفاظ کا بھی خوبصورت استعمال کیا۔ وہ اپنی نظم ''دلدار'' میں فرماتے ہیں:

رات بھر شور و غل　　　دل کھول خیالی
کلیجائے دک دول　　　دل نائے کھوالی
بڑو میٹھا شربت　　　بھر ہیر پیالی
کانے باجے نوبت　　　چوکھے لائے دیالی(۴۰)

رابندر ناتھ ٹھاکر (۱۹۴۱-۱۸۶۱) کے والد دیبندر ناتھ ٹھاکر (۱۹۰۵-۱۸۱۹) کو دیوان حافظ ازبر تھا- اسی لیے انہیں ''حافظ حافظ'' پکارا جاتا تھا۔(۴۱) زندگی کے آخری ایام میں حافظ کا یہ شعر ہمیشہ ان کے ورد زبان رہا کرتا تھا:

عیان نشد کہ چرا آمدم کجا بودم
درد و دریغا☆ کہ غافل زکار خویشم(۴۲)

رابندر ناتھ ٹھاکر نے بھی حافظ، سعدی اور خاقانی کے خیالات کو بنگلہ زبان کا روپ عطا کیا

☆ دریغ و درد کہ غافل زکار خویشتنم (م س ا)

Marfat.com

ہے۔

جدید بنگلہ ادب میں وسیع پیمانے پر عربی و فارسی الفاظ کا استعمال نذر الاسلام سے ہی شروع ہوا۔ ان کی پیدائش ایک مسلم گھرانے میں ہوئی۔ ان کے والد صوفی منش آدمی اور کم و بیش عربی و فارسی سے واقف تھے۔ نذر الاسلام کو اپنے والد سے عربی و فارسی سیکھنے کا موقع ملا۔ ان کے چچا قاضی بذل الکریم بھی فارسی ادب کے بڑے ماہر تھے۔ وہ اردو و فارسی نما بنگلہ غزلیں لکھتے اور گایا کرتے۔ نذر الاسلام نے ابتدائی عمر میں ان سے فارسی سیکھی اور ان کے دیکھا دیکھی عربی و فارسی آمیز بنگلہ زبان میں طبع آزمائی بھی کی۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران بنگالی پلٹن میں فارسی کے ماہر ایک پنجابی مولوی صاحب سے نذر الاسلام کی ملاقات ہوئی تو انہوں نے مولوی صاحب سے دیوان حافظ، مثنوی مولوی روم اور دوسری فارسی کتابیں پڑھیں۔ غرض انہیں عربی و فارسی سے واقفیت حاصل کرنے کا بارہا موقع ملا۔ (۴۲) اس لیے عربی و فارسی کے سینکڑوں الفاظ ان کی زبان میں شیر و شکر ہو گئے۔ انہوں نے عربی و فارسی الفاظ کا استعمال ایسی خوبی سے کیا ہے کہ اس سے عبارت کی روانی دوبالا ہو جاتی ہے۔ ان کی نظم ''محرم'' سے دو سطریں ملاحظہ ہوں۔

لال سیاہ آسمان لال لال ہو گیا
اماں لال تیری خون کیا خونیا
نیلا آسمان ہو گیا پوری دنیا سرخ ہو گئی
اے اماں! تیرے لال کو کس خونی نے خون کر دیا۔ (۴۳)

نذر الاسلام نے رباعیات عمر خیام اور رباعیات سعدی کا بھی بنگلہ زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ ڈاکٹر شہید اللہ نے عمر خیام کی رباعیات کا بنگلہ ترجمہ اور اس کا مقدمہ لکھا ہے۔ عمر خیام کے متعلق اس قدر تشریح بنگلہ زبان میں کسی اور نے نہیں کی۔ برکت اللہ نے فردوسی، رومی، جامی، عطار، سعدی، حافظ اور عمر خیام جیسے بلند پایہ شعراء کو اہل بنگال سے روشناس کرایا۔ انہوں نے ان شعراء کے کلام کا ترجمہ ٹکسالی بنگلہ نثر میں کیا ہے۔ انہوں نے پارشو پروتیبھا نامی کتاب بھی لکھی ہے۔

فارسی زبان و ادب پر آج بھی کام ہو رہا ہے۔ منصور الدین کی ایرانیر کوبی (اشاعت ۱۹۷۸ء) اور عبدالستار کی فارسی شاہیتر کلکروم (سن اشاعت ۱۹۸۷ء) اس کی مثالیں ہیں۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے پروفیسر محمد عبداللہ کی بنگلہ دیشے فارسی

Marfat.com

"شاهیتر ایتی هاش" ایک اہم تصنیف ہے۔ یہ کتاب بنگلہ دیش میں فارسی زبان و ادب کی خدمت کرنے والوں کی ایک جامع اور مستند تاریخ ہے۔ ان کے ساتھ منیر الدین یوسف بھی مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ۲۰ برس کی محنت شاقہ کے بعد شاہ نامہ فردوسی کا بنگلہ ترجمہ کر کے ایران کی اس قدیم تاریخی رزمیہ نظم کو بنگالی عوام سے روشناس کرایا ہے۔ جس طرح شاہ نامہ فردوسی ایک لافانی شاہکار ہے اسی طرح منیر الدین یوسف کا یہ بنگلہ کام بھی لافانی کارنامہ ہے۔

حواشی

۱- Rafiqul Islam, *Bangladesh: History and Culture*, p.154

۲- *Encyclopaedia of the Third World*, p.128

۳- ڈاکٹر شہید، بنگلہ ادب کی تاریخ، ص ۱۶

۴- Mohammad Abdur Rahim, *Social and Cultural History of Bengal*, p.26

۵- K.M.Ayub Ali, *History of Traditional Islamic Education in Bangla Desh*, p.11

۶- Mohd. Abdur Rahim, p.48

۷- انعام الحق، مسلم بنگالی ادب، ص ۵۶

۸- Narendra Nath Law, *Promotion of Learning During Muhammadan Rule*, p.110

۹- Ikram S.M. *The Cultural Heritage of Pakistan*, p.110

۱۰- انعام الحق، مسلم بنگالی ادب، ص ۵۶

۱۱- Abdul Karim, p.54

۱۲- S.M.Ikram, P.114

۱۳- Momtazur Rahman Tarafdar, *Husain Shahi Bengal*, p.226

۱۴- Tarafdar, p.227

۱۵- Muhammad Ishaq, *India's Contribution to Hadith Literature*, p.115

۱۶- Abdul Karim, p.136

۱۷- ڈاکٹر ظہور الدین احمد، پاکستان میں فارسی ادب، ص ۳-۱۲۲

۱۸- مسلم بنگالی ادب، ص ۱۰۲

۱۹- ایضاً، ص ۱۳۳

۲۰- سوغات، بنگلہ ۱۳۳۵، ص ۵۵۳

۲۱- Shaikh Ghulam Maqsud Hilali, *Perso-Arabic Elements in Bangali*, pp.vii-x

۲۲- Faiz Ahmad Choudhary, *Journal of the Regional Cultural Institute*, p.8

Marfat.com

۲۳- Horiadro Pal, *Perso-Arabic Dictionary*, p.2
۲۴- بنگلہ ادب کی تاریخ، ص ۱۷۷
۲۵- مسلم بنگالی ادب، ص ۲۲۸
۲۶- ایضاً، ص ۲۸۳
۲۷- ایضاً، ص ۲۸۷
۲۸- ایضاً، ص ۲۸۶
۲۹- ایضاً، ص ۲۸۸
۳۰- S.M. Imamuddin (ed.), *Tarikh-i-Bangala*, p.viii
۳۱- شیخ محمد اکرام، حیات غالب، ص ۸۰
۳۲- ڈاکٹر محمد عبداللہ، ساقی، کراچی، نومبر ۱۹۶۵، ص ۴۵
۳۳- احتشام حسین سید، اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، ص ۱۳۸
۳۴- Government of Bengal, *Report of the Madrasha Education Committee*, p.149
۳۵- عبدالستار، تاریخ مدرسہ عالیہ، ص ۱۰۲
۳۶- محمد عبداللہ، سپارہ، ص ۳۲
۳۷- بنگلہ ادب کی تاریخ، ص ۵۳۳
۳۸- ایضاً، ص ۵۳۹
۳۹- ایضاً، ص ۵۵۰
۴۰- *Cultural Heritage*, p.116
۴۱- ماہانہ محمدی (بنگلہ)، ص ۴۳۱
۴۲- رفیق الاسلام، نذر الاسلام حیات و شاعری (بنگلہ)، ص ۲۶
۴۳- محمد عبداللہ، نذر الاسلام، ص ۵۰

☆☆☆

Marfat.com

بلتستان میں فارسی ادبیات

محمد حسن حسرت☆

پاکستان کے انتہائی شمال میں سلسلہ کوہ قراقرم اور ہمالیہ کے درمیان دس ہزار مربع میل رقبہ پر محیط علاقہ ''بلتستان'' کہلاتا ہے جہاں کی سو فیصد آبادی مسلمان ہے۔ اس علاقے کی مقامی زبان ''بلتی'' کہلاتی ہے جو قدیم تبتی زبان کی ایک شاخ ہے۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ بلتستان میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت چودھویں صدی عیسوی میں ایرانی مبلغین کے ذریعے ہوئی جن میں سب سے مقدم اور اہم کردار امیر کبیر سید علی ہمدانی، سید محمد نوربخش، میر شمس الدین عراقی، میر ابوسعید، میر عارف، سید ناصر طوسی، سید علی طوسی، سید محمود طوسی، سید حیدر طوسی اور شیخ علی تہرانی وغیرہ کا ہے۔ ان علمائے کرام کے ساتھ بہت سے غیر سادات ایرانی بطور خدام آئے جن میں سے اکثر لوگ مختلف پیشوں سے منسلک تھے۔ تواریخ کے مطابق امیر کبیر سید علی ہمدانی کے ہمراہ سات سو افراد آئے تھے۔ یوں ان مبلغوں نے بلتیوں کو نہ صرف دین اسلام سے مشرف کیا بلکہ بلتستان میں علم و فن کے موتی بکھیرے جس کی بدولت یہاں کے معاشرتی آداب، رہن سہن، خورد و نوش، لباس، رسم و رواج اور ادب و شاعری پر ایرانی رنگ چڑھنے کے ساتھ ساتھ فارسی زبان کو اتنا فروغ ملا کہ اہل بلتستان نے قدیم بلتی رسم الخط ''اگیے'' کو ترک کر کے فارسی نستعلیق کو اپنانا شروع کر دیا جو آج بھی رائج ہے۔ گویا ان ایرانی مبلغین کے ہاتھوں بلتستان کی قدیم تہذیب و تمدن کے ماتھے پر اسلامی ثقافت اور فارسی ادب کا خوبصورت جھومر سجا۔ چونکہ علماء و مبلغین کے درس اور وعظ و نصیحتیں فارسی میں ہوتی تھیں اور مقامی اخوند ان کا بلتی میں ترجمہ کیا کرتے تھے اس لیے بلتی زبان میں فارسی زبان کی آمیزش ایک لازمی امر تھا۔ اس کے علاوہ بلتستان کے نامور حکمران خاندان ''مقپون'' کے مورث اعلیٰ ابراہیم شاہ کا تعلق بھی بعض مورخین کے مطابق ایران سے تھا۔ یوں بلتستان کے شاہی دربار کے آداب و رسوم، ہمعصر ایرانی حکومتوں کی درباری روایات سے متاثر تھے۔ مثلاً عزاداری سید الشہداء اور شبیہ بنانے کی ایرانی روایات پہلے برصغیر و کشمیر میں اور پھر بلتستان پہنچیں۔ جشن نوروز

☆ ریجنل ڈائریکٹر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی۔ گلگت

Marfat.com

کے علاوہ شاہی محل اور دربار میں نوبت کا بجایا جانا بھی ایران اور بلتستان کے مابین قدیم ثقافتی تبادلوں کی یاد دلاتا ہے۔ ان میں اکثر و بیشتر روایات آج بھی اس علاقے میں شد و مد سے جاری ہیں۔

مغلیہ دور میں ہندوستان کی درباری زبان فارسی تھی چنانچہ راجگان بلتستان کی مغلیہ دربار سے وابستگی بھی اس علاقے میں فارسی زبان کے فروغ کا سبب بنی۔ بلتستان کے راجے اپنے مراسلے اور احکامات فارسی زبان ہی میں جاری کرتے تھے۔ اسی دوران دربار اکبری کے معروف شاعر و ادیب ملا طالب اصفہانی نے بھی یہاں کا دورہ کر کے اس علاقے کی تہذیب، ادب اور ثقافت پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ بدایونی کے مطابق ملا طالب اصفہانی نے بلتستان (تبت خورد) کے رسم و رواج کے متعلق فارسی میں ایک رسالہ بھی مرتب کیا تھا لیکن اب یہ رسالہ ناپید ہے۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل تین نمونوں سے ظاہر ہے بلتستان کے راجاؤں کی مہروں پر بھی فارسی اشعار یا عبارات کندہ ہوتے تھے۔

۱- راجہ علی شیر خان ثانی (۱۸۰۰ء-۱۷۷۸ء)

فدوی عالمگیر

بادشاہ ۱۱۸۸ علی شیر خان غازی ◆

۲- مقپون احمد شاہ سکردو (۱۸۴۰-۱۸۰۰ء)

علی شیران داور دادگر
کز و یافت احمد شاہ براعداء ظفر

۳- راجہ حیدر خان حیدر اباچہ (۱۸۴۲-۱۸۴۲ء)

در نگینم اسم اعظم حیدر است

بتایا جاتا ہے کہ مقپون حکمرانوں کی تاریخ پر مشتمل قلمی نسخہ گلزار سکردو بھی فارسی زبان ہی میں تحریر تھا۔ یہ قلمی نسخہ مقپون راجہ ظفر خان (۱۷۷۸-۱۷۵۸ء) کے دور میں کھرپوچو میں موجود کتب خانہ کو آگ لگنے کی وجہ سے تلف ہو گیا۔ علاوہ ازیں ہبہ نامے، مچلکے، رسیدیں، نکاح نامے اور نجی خطوط بھی فارسی زبان میں رقم کیے جاتے تھے۔

دینی تعلیم کے لیے ابتدائی سطح پر فارسی کی کتابیں مثلاً کریما، گلستان، بوستان، پندنامہ، یوسف زلیخا، اخلاق محسنی، ابواب الجنان، روضۃ الشہداء، اور حملہ حیدری وغیرہ پڑھائی جاتی تھیں۔ دینی محافل میں

◆ بادشاہ ۱۱۸۸ علی شیر خان غازی: یہ سنگ مرمر کی مہر ہے جو اس وقت سکردو کے سید محمد عباس کاظمی کے پاس موجود ہے۔ ۱۱۸۸ ہجری قمری عیسوی سال ۱۷۷۰ء بنتا ہے۔

Marfat.com

فارسی کے معروف شعراء ملا کاشی، باذل، مقبل، وصال، قدسی اور بیدل کا کلام انتہائی ذوق اور عقیدت کی ساتھ پڑھا جاتا تھا۔شادی بیاہ کی تقریبات میں دولہا اور دلہن کے سر پر سہرا باندھتے وقت ہفت بند ملا کاشی سے اقتباس ترنم کے ساتھ پڑھنے کی رسم آج بھی یہاں رائج ہے۔ یہاں تک کہ رقص و سرود کی محفلوں میں بھی یہاں کے جوان فارسی زبان سے ناآشنا ہونے کے باوجود دیوان حافظ کے اشعار پڑھ کر اپنا شوق پورا کرتے تھے۔ بلتستان کی موسیقی پر بھی ایرانی رنگ غالب ہے۔ بعض مؤرخین کے مطابق یہ اثرات مغل ہندوستان سے روابط کے نتیجے میں مرتب ہوئے جبکہ بعض کا قیاس یہ ہے کہ بلتستان میں ایرانی مبلغین کے ذریعے ایرانی تہذیب کے اثرات براہ راست داخل ہوئے ہیں۔ چنانچہ بلتی موسیقی کے درج ذیل راگ اور حریب کے نام فارسی میں دستیاب ہیں جو حسینی، مغلوب، مخالف، عشاق، نوروز نجم، ہزار داستان، دور ساقی، باید، نوبت، یگہ، دوگہ، سہ گہ، چہار گہ، پنجگاہ، ذکر کلاں، ذکر خورد، اور ذکر مولا وغیرہ کہلاتے ہیں۔

بلتستان میں شادی بیاہ اور دیگر مذہبی تقریبات کے موقع پر جو خاص پکوان اور سالن بنائے جاتے ہیں ان میں سے اکثر کے نام بھی فارسی میں ہیں' مثلاً خوبانی کے تیل میں تلی ہوئی روٹی ''آذوق'' آب گوشت، شوربا، یخنی، کباب، قورمہ، گوشتابہ اور روغن جوش وغیرہ۔ مقامی روایات کے مطابق یہ چیزیں کشمیر سے یہاں آئی ہیں جبکہ خود اہل کشمیر کا بیان ہے کہ ان تمام چیزوں کا تعلق بنیادی طور پر ایرانی کلچر سے ہے اور الفاظ بھی من وعن فارسی ہی ہیں۔

بلتستان کی امام بارگاہوں، خانقاہوں اور مسجدوں میں مذہبی تقریبات کے آغاز میں عربی کے علاوہ فارسی میں بھی درود وسلام اور مجلس کے اختتام پر دعائیں اور دعائیہ اشعار پڑھنے کا رواج اب بھی جاری ہے۔ ذاکرین مجالس عزا پڑھتے ہوئے فارسی اشعار سے اہل مجلس کے دلوں کو گرماتے ہیں' مثلاً یہ فارسی اشعار خاص طور پر زبان زد عام ہیں:

از ما سلام بر تن صد پارۂ حسین
بر ہمرہان کشتہ و آوارۂ حسین
بر خفتگان ماریہ و رفتگان شام
آن اختران ثابت و سیارۂ حسین

اسی طرح عید کی محافل میں مقررین اپنی تقریر کے دوران درج ذیل فارسی اشعار

Marfat.com

مخصوص ترنم کے ساتھ بار بار پڑھتے ہیں جو سامعین بھی ہم آواز ہو کر بلند آہنگ کے ساتھ دہراتے ہیں:

ہزاران درود و ہزاران سلام
زما بر محمد علیہ السلام
درود د چوزے حال دارالسلام [؟]
کہ برشاہ مردان علیہ السلام
زتحت الثری بعرش مجید
صداے مبارک مبارک رسید

گویا بلتستان کے تمام شعبہ ہائے زندگی پر ایرانی تہذیب و ثقافت کے اثرات ایسے واضح ہیں کہ بلتستان کو بھی اگر کشمیر کی طرح ایران صغیر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

فارسی زبان کے ساتھ انسیت ہی کا نتیجہ ہے کہ بلتی زبان کے کم و بیش پانچ فیصد الفاظ فارسی الاصل ہیں۔ اس کے ساتھ ہی فارسی شاعری کی اصطلاحات بھی بلتی زبان میں استعمال ہوتی ہیں۔ مثلاً ''ستود خلو'' کو قصیدہ ''ہرژگ خلو'' کو مرثیہ ''ستیاق خلو'' کو نوحہ اور ''بوک خلو'' کو ہجو بھی کہا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں بلتستان کے شعراء نے بلتی عارفانہ کلام میں فارسی کے الفاظ بے تحاشا استعمال کیے ہیں' مثال کے طور پر ائمہ اطہارؑ کی شان میں بلتستان کے ملک الشعراء سید شاہ عباس کے یہ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔ ان اشعار میں خط کشیدہ الفاظ کے علاوہ باقی تمام الفاظ فارسی ہیں جن کا ترجمہ اردو میں حاشیہ پر دیا گیا ہے۔

ماہ چون فغفور چین کھوے اوتیکھ (۱) لمنہ چین (۲)
جام جم است چون ہلال کاسہ گدانی (۳) علی
زمانہ برسرجنگ است آقا وقت امداد است
نفس کھرزگق لاجوکتاسی (۴) دی گردش یو (۵) زمانی ان (۶)
چون عقیق لب او گشت زالماس بہ نقش
پارہ پارہ دل صد برگ ذ سمن سونگسید سوک (۷)
جمشید جم کاسہ گدا ہم کوچہ گردد کیقباد
ناز فقیر در گہت کاؤس کے سی کے بیاسید (۸)

۱- ان کے نور سے (۲) - کیا ہے؟ (۳) میرا (۴) قاعہ بند ہو جائے تو بھی (۵) حرف اشارہ (۶) ہے (۷) ہو گیا تھا (۸) کیا گیا ہے

Marfat.com

چنانچہ اشاعت اسلام کے بعد کی بلتی شاعری کی تمام اصناف سخن، علم عروض کے قواعد وضوابط اور شعری صنائع بدائع فارسی طرز پر ہی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ بلتستان کے بعض شعراء کا پورے کا پورا سرمایہ سخن ہی فارسی میں ہے۔ یوں بلتستان میں فارسی ادبیات کا بہت بڑا غیر مطبوعہ ذخیرہ موجود ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان بکھرے ہوئے شہ پاروں کو ایک لڑی میں پرو کر شائع کیا جائے، لیکن ایسا کون کر سکے گا؟ بلتستان میں ایسا کوئی ادارہ موجود نہیں جس کے پاس ایسے تحقیقی کاموں کی انجام دہی کے لیے مالی وسائل موجود ہوں۔

تاریخی کتب سے معلوم ہوتا ہے کہ شگر کے راجہ امام قلی خان (۱۷۰۵-۱۶۳۷ء) کے دور کے واقعات کو سید تحسین نے شاہنامہ فردوسی کی طرز پر فارسی زبان میں شغر نامہ کے نام سے نظم کیا تھا۔ اس کتاب کا سال تصنیف ۱۸۴۰ء سے قبل کا ہے۔ یہ نسخہ اب بھی قلمی صورت میں موجود ہے۔ بعض مؤرخ اس نسخہ کو سید تحسین کا اپنا نسخہ تسلیم نہیں کرتے جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کے ابتدائی چند اوراق جو حقیقت سے آشنائی میں مفید ہو سکتے تھے تلف ہو چکے ہیں۔ تاہم معلوم ہوا ہے کہ اس نسخے پر بون یونیورسٹی جرمنی نے پروفیسر خسرو بہروز کو خصوصی مشن پر مامور کر کے اس کا جرمن زبان میں ان سے ترجمہ کرایا ہے۔ مولوی حشمت اللہ خان کی تاریخ جموں میں بھی بلتستان کی تاریخ کے بیشتر ابواب شغر نامہ ہی سے ماخوذ ہیں۔ بعض محققین کے مطابق مذکورہ قلمی نسخہ شغر نامہ کے حاشیے پر سید نجم الدین ثاقب نے بعد میں منظوم کتاب فصل الخطاب بھی لکھ ڈالی۔ جو بلتستان میں اشاعت اسلامی کی تاریخ پر محیط ہے۔ فصل الخطاب سے اقتباس ملاحظہ کریں جس میں امیر کبیر سید علی ہمدانی کی بلتستان آمد کا تذکرہ یوں کیا گیا ہے۔

دو سہ سطر نگارم بنام علیم
ز تاریخ اسلام علیم
چگونہ طلوع شد شمس الہداء
دریں ملک تبت زفضل کریم
چو شب بود تبت ز ظلم و ضلال
فخر کرد ہر ایک بخلقش ذمیم
بعہد مقیم خان شاہ سلنگ
زہجرت دو میم و بہ یک دال و جیم

Marfat.com

طلوع کرد خورشید اسلام ہمی
علی ثانی آمد زفضل کریم
زکشمیر بہ تبت رسید آن ولی
بدستش عصا بود بربر گلیم
زخورشید اسلام تبت صغیر
ضیا کردہ پس کرد عزم صمیم
سوے ملک یارقند رویش نمود
بہ تبلیغ کرد جہد عظیم

راقم کے پاس فارسی، بلتی منظوم لغت کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے جسے لوگ سکردو کے سید فضل شاہ سے منسوب کرتے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ موصوف نے اپنے شاگردوں کو فارسی سکھانے کے لیے منظوم نصاب تیار کیا تھا جو فارسی بلتی لغت کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ نصاب تقریباً چارسو ابیات پر مشتمل ہے۔ ذیل میں اس لغت سے چند اشعار بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں جن میں خط کشیدہ الفاظ بلتی ہیں جن کے معنی انہی اشعار کے اندر موجود ہیں:

زمیت برن و مزرعہ تبہ است
بود سون تخم و خلنگ گاونر
کہ گندم بود کڑوسہ پہلو است بر
نس و چھ جو و گال دان سربسر
ژے ژے ارزن و نقسترن است باقلہ
مشنگ است پوقسترن ربچ است غبیر

کتابیات

۱۔ بنات گل آفریدی، بلتستان ان ہسٹری، ۱۹۸۸ء
۲۔ (مولوی) حشمت اللہ خان، تاریخ جموں، ۱۹۳۶ء
۳۔ محمد حسن حسرت، تاریخ ادبیات بلتستان، ۱۹۹۲ء
۴۔ محمد یوسف حسین آبادی، بلتستان پر ایک نظر، ۱۹۸۲ء

☆☆☆

Marfat.com

فنون

Marfat.com

فن تاریخ گوئی میں سالم تاریخیں

سید محمد عبداللہ قادری☆

تاریخ گوئی ایک مفید' دلچسپ اور مشکل فن ہے۔ اس فن کی افادیت کے بارے میں مشہور شاعر جلال لکھنوی تحریر کرتے ہیں:

جاننا چاہیے کہ تاریخ لغت میں کسی چیز کے وقت ظاہر کرنے کو کہتے ہیں اور مورخین یعنی تاریخ گویوں کی اصطلاح میں کسی امر عظیم اور واقعہ قدیم دمشہور مانند کسی بادشاہ کی سلطنت یا کسی فتنہ و فساد و جنگ وکارزار یا شادی و مرگ یا بنائے عمارت و باغ وغیرہ ودیگر سوانح کی ابتدا کی مدت معین کرنے کو بولتے ہیں۔ (۱)

پروفیسر براؤن نے اس فن کی تعریف یوں کی ہے:

تاریخ یا Chronogram اسے کہتے ہیں جس میں ''حروف کا مجموعہ'' جمل (ابجد) کے قاعدے سے ایک مصرعے' جملے یا کلمے میں واقعہ کی تاریخ یاد دلائے۔ (۲)

تاریخ کی دو قسمیں ہیں' سالم اور ناقص۔ سالم تاریخ کی تعریف یہ ہے کہ اگر مادہ تاریخ کے سارے حروف کے اعداد بحساب جمل (صغیر یا جمل کبیر) جمع کیے جائیں تو وہ تاریخ جو ہمیں مطلوب ہو بلا کسی کی بیشی کے نکل آئے مثلاً حضرت شاہ دولہ دریائی رحمۃ اللہ علیہ کی تاریخ وفات (م ۱۰۸۵ھ)

''شاہ دولہ بجنت رسیدہ''(۳)

۱۰۸۵ھ

اور یہی طریقہ تاریخ گوئی سب سے زیادہ مقبول' مشہور اور جامع ہے اور بیشتر بہترین تاریخیں اسی طریقہ سے نکالی گئی ہیں اور نکالی جاتی ہیں۔ ذیل میں چند کمیاب اور غیر مطبوعہ تاریخیں ملاحظہ ہوں جو اس طریقہ کی بہترین نمائندگی کرتی ہیں۔ مولوی امام بخش صہبائی کے بیٹے مولوی عبدالکریم سوز نے اپنے استاد ذوق مرحوم کی وفات پر ۳۶ اشعار پر مشتمل ایک قطعہ تاریخ لکھا جس کے تین اشعار درج ذیل ہیں:

☆ ۲۰-الف ۲۲۵ واہ کینٹ

Marfat.com

سوز سے میں نے کہا تو کس لیے خاموش ہے
ایک عالم جب کہ ہے اس میں سخن آرا ہوا
تو بھی تاریخ وفات ذوق کی کچھ فکر کر
ہو کے شاعر بزم میں تو کس لیے چپکا ہوا
بس کہ تھا وہ صاحب فکر رسا، فوراً کہا!
دیکھتے ہی دیکھتے اب یار کیا سے کیا ہوا (۴)

۱۲۷۱ھ

سوز نے تاریخ کی صنعت کو اس انداز سے نظم کیا ہے کہ شعر کی روانی اور برجستگی میں کوئی فرق نہیں آیا اور یہی کمال فن ہے۔

مرزا حاجی سرحدی (م ۱۹۴۶ء) جناب انجم رضوانی صاحب کے والد مکرم قاضی محمد متقی کے گہرے دوست تھے۔ قاضی صاحب کی وفات (۱۹۴۴ء) پر متعدد تاریخیں کہی گئیں۔ صرف ایک ملاحظہ ہو:

اک نہ ہونے سے ترے دنیا ہماری مٹ گئی
زیست تھی وابستہ تجھ سے، آہ تو تھا مغتنم
میں ہوں حاجی مضطرب، مغموم و محزون و ملول
"فکر پیہم بڑھ رہی ہے غم بپا ہے دم بدم" (۵)

۱۹۴۴ء

سید نور محمد قادری کے چچازاد بھائی سید نظیر حسین خلف حکیم ظہور اللہ شاہ سیالکوٹی (م ۱۹۴۶ء) کم سنی میں وفات پا گئے تو حکیم صاحب کے دوست اور ضلع سیالکوٹ کے خوش گو فارسی شاعر اور فاضل مولانا غلام حسین صاحب غلام ساکن ساہووالہ نے ۴۷ اشعار پر مشتمل فارسی زبان میں ایک پر درد مرثیہ لکھا اور مقطع سے تاریخ وفات نکالی جو یہ ہے:

سال وصال آن گل رعنا، غلام گفت
الحق خزان وزید بگلزار حیدری (۶)

۱۳۲۱ھ (غیر مطبوعہ)

Marfat.com

مولوی غلام حسین صاحب مرحوم نے ہی میرے پردادا مفتی سیالکوٹ مولوی چراغ شاہ صاحب (۱۳۰۴ھ) کی وفات پر فصیح و بلیغ فارسی میں ۳۷ اشعار پر مشتمل ایک مرثیہ لکھا اور دو تاریخیں ایک ان کے نام کی مناسبت سے ''بے او جہانے بے چراغ'' اور ایک ''لرضی الحق عنہ'' سے نکالیں اور ان کو ایک ہی شعر میں نظم کیا جو حسب ذیل ہے:

نوک کلکم زد رقم ''بے او جہانے بے چراغ''

۱۳۰۴ھ

پس ''لرضی الحق عنہ'' نیز تاریخش شمار (۷)

۱۳۰۴ھ (غیر مطبوعہ)

حضرت خواجہ غلام فرید علیہ الرحمۃ (م ۱۳۱۹ھ) نے ۱۳۱۴ھ میں ایک مسقّف صفہ کوٹ مٹھن میں بنوایا۔ خواجہ صاحب کے مرید مولانا اختر بہاولپوری نے فارسی زبان میں دس اشعار پر مشتمل قطعہ تاریخ تعمیر لکھا اور مقطع میں تاریخ کہی۔ ملاحظہ ہو:

خرد لطیفہ تاریخ آن بہ اختر گفت

''زدرک پایہ او دست آسمان کوتاہ'' (۸)

۱۳۱۴ھ

جب یہ قطعہ اور تاریخ مولانا عبدالمالک کھوڑوی (مشہور مزاح نگار خالد اختر کے دادا) م ۱۹۴۱ء کی نظر سے گذری تو انہوں نے کہا:

''آپ (اختر) حضرت علیہ الرحمۃ کے مقربان خاص سے ہیں اور حضرت علیہ الرحمۃ کو ان کی آتش زبانی پر فخر تھا۔ قصر فریدیہ (صفہ) کی تعریف میں آپ کا مطلع:

کشود پردہ زرخ این بنای عرش نظیر

مطاف پاک دلان چون حریم بیت اللہ

بہت ہی بڑی شان کا مطلع ہے اور تاریخ تو ایک الہام ہے۔

''زدرک پایہ او دست آسمان کوتاہ'' (۹)

۱۳۱۴ھ

تاریخ میں بھی ان کی فصاحت و بلاغت کی بلند پروازی اور نازک خیالی کا جلوہ عیاں ہے۔

جناب مولانا اصغر علی روحی سابق صدر شعبہ عربی و فارسی اسلامیہ کالج لاہور نے اپنی کتاب دبیر عجم کی تاریخ خود لکھی ہے جو یہ ہے۔

Marfat.com

جوانی بخوابم در آمد سحر گاہ
بحسن ادابستہ نقش مرادم
چو پرسیدمش کیستی و ز کجائی
بگفتا ''دبیر عجم خوش سوادم'' (۱۰)

۱۳۴۶ھ

مشہور عالم دین سید دیدار علی شاہ الوری (م ۱۳۵۴ھ) کی وفات پر مولانا محمد شریف کوٹلی لوہاراں ضلع سیالکوٹ نے کہا:

دلم بہر سال وفاتش بگفت
بگو ''قبلہ عالم خلوت گزید'' (۱۱)

۱۳۵۴ھ

مولانا علی حیدر نظر طباطبائی نے تاریخ اردو ترجمہ وکار آف ویکفیلڈ اس طرح کہی:

اک مصرع میں ہوئی تقریظ بھی تاریخ بھی
''ہے فرنگن زیور ہندوستان پہنے ہوئے'' (۱۲)

۱۳۰۲ھ

خواجہ پیر حسینی عالم پوری نے جناب مولوی نذیر احمد صاحب کی تاریخ وفات ان کے فرزند بشیر الدین کی زبان سے یوں کہلوائی ہے:

خواجہ ز بشیر گفت برخوان
''واغفرلابی'' سن وفاتش (۱۳)

۱۳۳۰ھ

حکیم لطیف احمد لطیف نے مولانا کی تاریخ وفات اس طرح لکھی ہے:

ملحوظ رہے لطیف یہ مصرع سال
''مدفن یہ ہے مولوی نذیر احمد کا'' (۱۴)

۱۳۳۰ھ

نواب محسن الملک مرحوم کی تاریخ وفات مشہور شاعر وجاہت حسین وجاہت نے لکھی جو حسب ذیل ہے

Marfat.com

لکھ وجاہت تو یہ تاریخ وفات
''اٹھ گئے ہستی سے محسن قوم کے''(۱۵)

۱۳۲۵ھ

راسخ دہلوی کی تاریخ وفات بھی وجاہت نے بڑے دل کش انداز میں کہی ہے:

غم سے ٹوٹے دل وجاہت کا نہ کیوں
یاد راسخ آئے گی بار بار(۱۶)

۱۳۲۵ھ

مشہور شاعر عزیز لکھنوی نے اپنی بیٹی کی وفات پر کہا:

پردۂ شب میں ہوئی تو راہی باغ جناں
اس لیے تاریخ غم بھی ہے ''شب غم'' سے عیاں (۱۷)

۱۳۴۲ھ

حضرت صاحبزادہ محبوب عالم قادری رحمتہ اللہ علیہ سجادہ نشین دربار آوان شریف ضلع گجرات کی وفات پر جناب ابوالطاہر فدا حسین فدا نے کہا:

کہیے ان کا سن وصال فدا
''رحلت زبدۂ خلائق، آہ!''(۱۸)

۱۴۰۳ھ

حضرت صاحبزادہ محبوب عالم قادری رحمتہ اللہ علیہ کی وفات پر ہی جناب پروفیسر محمد شریف کنجاہی دام ظلہ نے چار اشعار پر مشتمل تاریخی قطعہ لکھا اور مندرجہ ذیل شعر میں تاریخ نظم کی:

''مظہر انوار'' ہم ''خورشید زآوانے غروب''

۱۴۰۳ھ　　　۱۴۰۳ھ

می شود سال وصال قاضی محبوب ما(۱۹)

علامہ رشید ترابی مرحوم کی وفات پر جناب ضیاء الحسن موسوی صاحب نے بے مثل تاریخ کہی۔ ملاحظہ ہو:

Marfat.com

''اک گل بے رنگ ہے یا گوہر بے آب ہے
طور سینا بے کلیم اللہ' منبر بے رشید''

دونوں مصرعوں کے مجموعی اعداد سے سن عیسوی ۱۹۷۲ء نکلتا ہے۔ (۲۰)

مشہور شاعر جناب بیخود دہلوی کے چار سالہ بیٹے کی وفات پر مرزا ثاقب لکھنوی نے ایک مصرع میں تاریخ کہی:

''معصوم محوِ خواب ہے کنجِ مزار میں'' (۲۱)

۱۳۳۵ھ

مشہور شاعر اور نقاد جلال لکھنوی کی وفات پر وجاہت حسین وجاہت جھنجھانوی نے ۱۹ اشعار پر مشتمل تاریخی قطعہ لکھا۔ مقطع ملاحظہ ہو:

ٹوٹا ہے سنگِ غم سے وجاہت کا دل بھی آج
''ضامن علی جلال کا صدمہ ہوا کمال'' (۲۲)

۱۳۴۷ھ

تاریخی قطعوں میں غالباً سب سے اچھا' بے مثل اور جامع فارسی زبان میں چار اشعار پر مشتمل ایک قطعہ ہے جس کے خالق ایک انگریز پروفیسر تامس ولیم بیل ہیں۔ یہ قطعہ حضرات پنجتن پاک کی تاریخہائے وفات سے تعلق رکھتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

رفتم بباغ فکر و دویدم بہ ہر چمن
درشوق چیدن گل تاریخ پنج تن
ہر غنچہ را کشودم و جستم ز ہر گلے
ناگہ ندا ز بلبلے آمد بہ گوش من
احمدؐ و فاطمہؑ و حسینؑ و علیؑ ' حسنؑ
تاریخ فوت شان بجو الا ز ''یا ثمن''
اول دو حرف بہر محمدؐ و فاطمہؑ
باقی سہ حرف بہر حسینؑ و علیؑ حسنؑ

اس قطعہ تاریخ کو جناب ابراہیم خلیل اپنے مضمون ''فن تاریخ گوئی'' میں درج کرنے کے بعد اس کے متعلق لکھتے ہیں:

''مورخ نے ''یا ثمن'' کے یا سے سال رحلت حضرت احمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و حضرت فاطمہ (س)

Marfat.com

(۱۱ھ) س سے حضرت امام حسینؑ (۶۰ھ) م سے حضرت علیؑ (۴۰ھ) اور ن سے حضرت امام حسن (۵۰ھ) نکالا ہے۔ بیل نے بلاشبہ بڑا قابل قدر مادہ تاریخ بہم پہنچایا ہے۔ باوجود مذہبی عدم موانست انہوں نے فرقِ مراتب کو ملحوظ رکھا ہے۔ جن بزرگوں کی تاریخ نکالی ان کے شایانِ شان لفظ کو مادہ تاریخ قرار دیا۔ علاوہ ازیں وہ پانچ اشخاص جو ایک عقیدے کے تحت ایک لڑی کے در بے بہا ہیں لیکن جنہوں نے پانچ مختلف سنوں میں رحلت کی ہے انہیں ایک ہی مادہ تاریخ ''یاسین'' سے وابستہ کیا ہے۔ خالص فنی نقطہ نظر سے یہ تاریخ مفرد کی نادر مثال ہے جس کی نظیر ملنی دشوار ہے۔ (۲۳)

مرزا داغ دہلوی کی وفات کی تاریخ جناب جلیل مانک پوری نے ایک بے مثل مصرع سے نکالی۔ ملاحظہ ہو:

ہے مصرع سالِ رحلتِ داغ
''صد حیف وہ دل کو دے گئے داغ'' (۲۴)

۱۳۲۲ھ

نولکشور پریس لکھنو کا مثنوی مولانا روم کا پہلا ایڈیشن ۱۸۶۶ء میں طبع ہوا۔ اصغر علی نسیم نے یہ تاریخ کہی:

پے تاریخ ایمائے بہنا شد
بسال عیسوی دل آشنا شد
چناں مصراع نو زیب زبان کرد
''حدیث از عشق حق عاشق بیان کرد'' (۲۵)

۱۸۶۶ء

حکیم احسن اللہ خان کی وفات پر نواب ضیاء الدین احمد خان نیر رخشاں نے عجیب و غریب تاریخ کہی:

''صبا'' اگر عدد خود کنی رقم پیہم
خبر دہی ز سنِ فوت احسن اللہ خاں (۲۶)

یعنی اگر صبا کے تین حروف کے اعداد کو جو بالترتیب ۹۰، ۲ اور ایک ہیں پیہم یعنی پہلے ۹۰ ان کے بعد ۲ اور اس کے بعد ایک متصل لکھا جائے تو ۱۲۹۰ بنتے ہیں جو حکیم احسن اللہ خان کی وفات کا ہجری سن ہے۔

Marfat.com

اب ذیل میں ایسی سالم تاریخیں درج کی جاتی ہیں جو زبر و بینات کے طریقے سے نکالی گئی ہیں۔ کسی لفظ کے پہلے حرف کے اعداد کو زبر اور باقی تمام حروف کے اعداد کو بینات کہتے ہیں۔ مثلاً الف کے پہلے حرف ''ا'' کا عدد ایک ہے۔ یہ زبر کہلاتا ہے اور باقی دو حروف ''ل'' اور ''ف'' کے اعداد ۳۰ + ۸۰ = ۱۱۰ ہیں جو بینات کہلاتے ہیں۔ اس طرح لفظ الف کے مجموعی اعداد ۱۱۱ بنتے ہیں جو زبر و بینات کہلاتے ہیں۔ یہ اگرچہ انتہائی مشکل صنعت ہے لیکن پھر بھی اہل کمال نے بڑی بڑی نفیس تاریخیں بہم پہنچائی ہیں۔ چند ایک ملاحظہ ہوں:

مرزا حاجی سرحدی نے اپنے مرشد حضرت قاضی سلطان محمود صاحب قادری علیہ الرحمتہ دربار آوان شریف گجرات کی وفات پر کہا:

در زبر بیّنہ بگو حاجی
سالِ فوت است ''صاجی قاضی''؛ (۲۷)

حل ملاحظہ ہو:

صاد + الف + حا + با + یا + ق + الف + ضاد + یا

۹۵ + ۱۱۱ + ۹ + ۲ + ۱۱ + ۱۸۱ + ۱۱۱ + ۸۰۵ + ۱۱ = ۱۳۳۷ھ

جناب سید محفوظ علی صابر القادری نے اپنی کتاب ارمغان حق (شعر) میں بھی بر صنعت زبر و بیّنہ میں چند تاریخیں کہی ہیں۔ ملاحظہ ہوں:

''ابیات ولادت نبی'' صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

۱۳۸۸ھ

حل ملاحظہ فرمائیں:

الف + با + یا + الف + تا + واؤ + لام + الف + دال + تا + نون + با + یا

۱۱۱ + ۳ + ۱۱ + ۱۱۱ + ۴۰۱ + ۱۳ + ۷۱ + ۱۱۱ + ۳۵ + ۴۰۱ + ۱۰۶ + ۳ + ۱۱ = ۱۳۸۸ھ (۲۸)

''ابیات ولادت محبوبی''

۱۳۹۷ھ

حل: الف + با + یا + الف + تا + واؤ + لام + الف + دال + تا + میم + حا + با + واؤ + با + یا

۱۱۱ + ۲ + ۱۱ + ۱۱۱ + ۴۰۱ + ۱۳ + ۷۱ + ۱۱۱ + ۳۵ + ۴۰۱ + ۹۰ + ۹ + ۳ + ۱۳ + ۳ + ۱۱ = ۱۳۹۷ھ (۲۹)

Marfat.com

''نغمہ درود و سلام''

۱۹۵۱ء

نون + غین + میم + ہا + دال + را + واؤ + دال + واؤ + سین + لام + الف + میم

(۳۰)۱۹۵۱=۹۰+۱۱۱+۷۱+۱۲۰+۱۳+۳۵+۱۳+۲۰۱+۳۵+۶+۹۰+۱۰۶۰+۱۰۶

حکیم محمد نبی خان جمال سویدا صاحب نے اپنی کتاب نقش سویدا (شعری مجموعہ) کے متعلق خود تاریخیں کہی ہیں۔ چند پیش خدمت ہیں:

تاریخ کوٹھی ''جہان نما'' ۵۵ گلبرگ لاہور

گوش مشتاق از لب مہر جہان مژدہ شنید
''قصر جنت بر زمین از آسمان آمد پدید''(۳۱)

۱۳۷۷ھ

تاریخ آغاز ترتیب و تدوین ''نقش سویدا'':

دل نشین رہتا ہے خال رخ جاناں کی طرح
''نقش برآب نہیں نقش سویدائے جمال''(۳۲)

۱۳۸۵ھ

تاریخ آغاز شاعری، وتکمیل و طباعت ''نقش سویدا''
پہلے مصرعہ سے شاعری کے آغاز کا سن دوسرے مصرعہ میں نقش سویدا کی تکمیل و طباعت:

''بن گیا سوز محبت کے تسلسل سے جمال''

۱۳۶۰ھ

''نازش حسن وفا نقش سویدا کا نکھار''

۱۳۹۱ھ

حکیم محمد نبی خان جمال سویدا نے اپنے والد گرامی حکیم جمیل خان خلف الرشید مسیح الملک حافظ حکیم محمد اجمل خان کی تاریخ یوں کہی ہے: مادہ تاریخ = ''افق حذاقت''

۱۳۹۰ھ

حسب ذیل شعر سے پوری تاریخ کہی ہے

''متفکر محقق بصیر و عقیل
طبیب یگانہ محمد جمیل''(۳۳)

۱۳۹۰ھ

Marfat.com

حکیم محمد نبی خاں جمالِ سویدا نے اپنے شفیق استاد' بھائی (جو ان کے بچپن کے ساتھی تھے۔ جناب حکیم حبیب احمد اشعر مرحوم خلف حکیم قاسم جان مرحوم کی تاریخ وفات یوں کہی ہے:

''اشعر نکتہ داں شعور افروز''

۱۹۷۱ء

مندرجہ ذیل تاریخ کے پہلے مصرع سے ولادت کا سن سامنے آتا ہے اور دوسرے سن وفات:

''خاک اشعر برزمین عالی وقار''

۱۹۱۹ء

''کاخ اشعر بر فلک نوری مقام''(۳۵)

۱۹۷۱ء

میر وارث علی نالاں تخلص کی تاریخ وفات جوشش نے یوں کہی ہے:

جوشش اس کی وفات کی تاریخ
''میر وارث علی نالاں'' ہے (۳۶)

۱۱۹۹ھ

مبلغ الاسلام ڈاکٹر فضل الرحمن انصاری (۱۹۷۴) کی تاریخ وصال آرزو اکبر آبادی نے یوں کہی ہے۔

دامن رحمت میں جا کر سو گئے
''عابد حق فضل رحمان'' آرزو (۳۷)

۱۳۹۴ھ

مولانا سید دیدار علی شاہ الوری (م ۱۹۳۵) کا قطعہ تاریخ وصال ان کے فرزند ارجمند مولانا سید ابوالحسنات نے یوں لکھا ہے:

حافظ پس سرکوبی اعداء شریعت
''دیدار علی یافتہ دیدار علی را'' (۳۸)

۱۳۵۴ھ

فقیہ اعظم مولانا مفتی محمد امید علی خان (م ۱۹۶۴) کی تاریخ وفات مولانا حبیب

Marfat.com

احمد افق نے اس طرح لکھی ہے:

بعد از دعائے مغفرت تاریخ نقلش گو افق
''شد واصل حق مفتی امید علی والا مکان''(۳۹)

۱۳۸۲ھ

مولانا محمد قدیر بخش بدایونی کی تاریخ وفات مولانا محمد یعقوب حسین ضیاء القادری نے یوں لکھی ہے:

ضیا تلاش ہے تاریخ کی تو کہہ دیجے
''ولی حبیب محمد قدیر بخش'' ہے سال(۴۰)

۱۳۷۶ھ

مولانا حسن رضا بریلوی مرزا داغ دہلوی کے شاگرد اور مولانا احمد رضا بریلوی کے چھوٹے بھائی تھے۔ ان کا مجموعہ کلام شعر حسن معروف ہے۔ مولانا حسن رضا بریلوی بھی فن تاریخ گوئی میں مہارت رکھتے تھے۔ مولانا حسن رضا بریلوی نے اپنے استاد محترم داغ دہلوی کی تاریخ وفات یوں کہی ہے:

مرگ استاد کی حسن تاریخ
''داغ نواب میرزا'' کہیے(۴۱)

۱۳۲۲ھ

مرزا داغؒ کے دیوان آفتاب داغ کی تاریخ ملاحظہ ہو:

سربدیں بھی کا اڑ چکا تاریخ لکھو تم!!
''پری رویوں کا جمگھٹ ہے یہ میلا ہے حسینوں کا''(۴۲)

۱۳۰۲ھ

مولانا حسن رضا' احسان شاہ جہان پوری کے دیوان کی تاریخ یوں کہتے ہیں:

چو مصر شد ز احسان پی سال طبع دیوان
سخن شگرف گفتم، سخن شگرف گفتم(۴۳)

۱۳۰۹ھ ۱۳۰۹ھ

اثر لکھنوی کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیں۔ انہوں نے بھی لفظ شگرف کو کیسے استعمال

Marfat.com

کیا ہے:

معلوم نہیں کون ہوں اور کیا ہوں میں
فطرت کا شگرف اک معما ہوں میں

مولانا حسن رضا نے مولوی نور محمد مدرس مدرسہ ہاشمیہ بمبئی کے دیوان کی تاریخ یوں لکھی:

''شمع انور سے ہوئی بزم سخن کی رونق'' (۴۴)

۱۹۰۰ء

مولانا حسن رضا نے حکیم احمد رضا خاں کی مسجد کی تاریخ اس طرح کہی ہے:

مسجد دین متین اہل سنت سج گئی

۱۳۲۰ھ

مولانا حسن رضا بریلوی نے حکیم محمود خاں (والد مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں) کی تاریخ وفات کا ایک مادہ تاریخ ''رحلت محمود عاقبت'' لکھا ہے۔

۱۳۰۹ھ

تاریخ وفات بھی ملاحظہ ہو کہ حسن رضا بریلوی نے تاریخ کہتے ہوئے ''لفظ سونا' طلاء کو کس طرح استعمال کیا ہے۔

سونا ہے مرگ نیک نم نزہتہ العروس
سونا طلا ہے کیوں نہ ہو تاریخ پھر طلا (۴۶)

۱۳۰۹ھ

حکیم سید برکت علی نامی نے مولانا حسن رضا بریلوی کی تاریخ یوں لکھی ہے:

ہر کہ پرسید زمن باعث غم
گفتمش'' سوئے جنان رفت استاد'' (۴۷)

۱۳۲۶ھ

مولانا غلام احمد اخگر امرتسری نے مولانا احمد رضا بریلوی کی تاریخ ہائے وصال اس طرح کہی ہیں:

گفت اخگر بہر تاریخ وصال
''نادر العصر آفتاب علم و دیں''

دیگر

۱۳۴۰ھ

Marfat.com

وصل حق چوں رضائے احمد یافت
قدوہ عالمان بر و بحر
کلک اخگر نوشت سال وفات
''زبدہ مومنین و فاضل دہر''(۴۸)

۱۳۴۰ھ

جناب محمد مرید احمد چشتی کی مرتبہ کتاب جہان رضا کی تاریخ طباعت ابوالطاہر فدا حسین فدا نے یوں کہی ہے:

قدسی پکار اٹھے برجستہ یوں فدا سے
سال طباعت اس کا کہہ ''گلشن رضا'' (۴۹)

۱۴۰۱ھ

منشی بھگوان دیال المتخلص عاقل (ایجنٹ) نے مرزا اسد اللہ خان غالب کے دیوان غالب مطبوعہ ۱۳۰۴ھ/ ۱۸۸۷ء پر دو قطعہ ہائے تاریخ طبع یوں رقم کیے ہیں:

طبع دیوان غالب اردو شد
گشت شائع چہ خوشترین نطقے
بہر تاریخ سال او عاقل
گفتمش دلربا بدیعین نطقے

۱۳۰۴ھ

زبسکہ انبوہ مشتری شد ز چاپ دیوان غالب اردو
فزوں ز تعداد طبع ایندم شمار تعداد طالب آمد
چوں سر بزانوی فکر بردم برای تاریخ سال عاقل
ندا ز پیر خرد بگوشم ''نفیس دیوان غالب آمد'' (۵۰)

۱۳۰۴ھ

پیر سید غلام حیدر علی شاہ جلال پوری (م ۱۹۰۸ء) کی تاریخ وصال حضرت علامہ محمد اقبالؒ نے یوں کہی ہے

ہاتف از گردوں رسید و خاک او را بوسہ داد
گفتمش سال وفات او بگو ''مغفور'' گفت (۵۱)

۱۳۲۶ھ

Marfat.com

حضرت علامہ محمد اقبال علیہ الرحمتہ نے اپنی رفیقہ حیات مختار بیگم (م ۱۹۲۴ء) کی تاریخ وصال یوں لکھی ہے:

اے دریغا! زمرگ ہم سفرے
دل من در فراق او ہمہ درد
ہاتف از غیب داد تسکینم
سخن پاک مصطفیٰ آورد
بہر سال رحیل او فرمود
"بشہادت رسید و منزل کرد" (۵۲)

۱۳۴۲ھ

حضرت علامہ محمد اقبال علیہ الرحمتہ نے اپنی رفیقہ حیات سردار بیگم (م ۱۹۳۵ء) والدہ ڈاکٹر جاوید اقبال کی تاریخ وفات یوں کہی ہے:

راہی سوئے فردوس ہوئی مادر جاوید
لالے کا خیاباں ہے میرا سینہ پرداغ
ہے موت سے مومن کی نگہ روشن و بیدار
اقبال نے تاریخ کہی "سرمہ مازاغ" (۵۳)

۱۳۵۴ھ

اکبر آلہ آبادی نے حضرت علامہ محمد اقبال علیہ الرحمتہ کی والدہ ماجدہ امام بی بی رحمتہ اللہ علیہا (م ۱۳۳۳ھ) کی تاریخ وصال یوں رقم کی ہے:

مادر مرحومہ اقبال رفت
سوے جنت زین جہان بے ثبات
گفت اکبر بادل پر درد و غم
"رحلت مخدومہ" تاریخ وفات (۵۴)

۱۳۳۳ھ

حضرت علامہ محمد اقبالؒ نے اپنے والد ماجد شیخ نور محمد (م ۱۹۳۰ء) مدفون درگاہ حضرت امام علی الحق صاحبؒ سیالکوٹ کی تاریخ وصال یوں لکھی:

Marfat.com

پدر و مرشد اقبال ازیں عالم رفت
ماہمہ راہروان منزل ما ملک ابد
ہاتف از حضرت حق خواست دو تاریخ رحیل
آمد آواز ''اثر رحمت'' و ''آغوش لحد'' (۵۵)

۱۳۴۹ھ	۱۳۴۹ھ

میر وزیر علی صبا، شاگرد آتش لکھنوی (م ۱۲۷۱ھ) کی تاریخ، شیخ امداد علی بحر، شاگرد ناسخ نے یوں رقم کی ہے جو صرف ایک مصرع میں ہے۔

''چمن ہستی موہوم صبا شد برباد'' (۵۶)

۱۲۷۱ھ

شمس الدین شائق ایزدی (۱۸۶۴ء - ۱۹۳۶ء) کی تاریخ وفات جناب دل محمد ایم اے نے اس طرح کہی ہے:

آہ شمس الدین شائق چل بسے
دوستوں کو رنج بے پایاں ہوا
عرض کی دل نے یہ تاریخ وفات
''انتقال ناظم قرآن ہوا'' (۵۷)

۱۳۵۵ھ

مآخذ

۱۔ نقوش لاہور (عصری ادب نمبر) ستمبر ۱۹۸۲ء مضمون جناب ڈاکٹر فرمان فتحپوری، ص ۶۲۔

۲۔ سہ ماہی اردو نامہ کراچی جنوری ۱۹۷۰ء مضمون ابراہیم خلیل، ص ۱۰۱

۳۔ منخبر الواصلین از محمد فاضل مظہر الحق، مظہر، غمگین دہلی ۱۳۸۵ھ ص ۱۲۵

۴۔ محمد فاضل اکبر آبادی (م ۱۱۰۵ھ) برصغیر کے ممتاز ترین تاریخ گو تھے۔ کبھی مظہر الحق، کبھی مظہر اور کبھی غمگین تخلص کرتے تھے۔ آپ کی تصنیف فخر الواصلین کا شمار تاریخ گوئی کی بہترین کتابوں میں ہوتا ہے۔ اگرچہ اب تک اس کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں لیکن کتاب اب بھی نادر و نایاب ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن کلکتہ ۱۲۹۴ھ میں چھپا۔ دوسرا مطبع مصطفائی سے (سن نامعلوم) تیسرا دہلی ہی سے ۱۳۸۵ھ میں۔ کتاب چھپنے سے پہلے ہی مقبول ہو چکے تھے اور لوگ اس کے قلمی نسخوں سے استفادہ کرتے تھے۔ کتاب ریاض الفردوس از مولوی محمد حسین خاں شاہ

Marfat.com

جہان پوری ۱۲۷۶ھ میں مرتب ہوئی یعنی فخر الواصلین کی اشاعت اول سے اٹھارہ سال پہلے اور اس میں مظہر الحق کی کہی ہوئی کافی تاریخیں موجود ہیں۔

۴-۱ دیب اردو' مرتبہ مولوی اسماعیل میرٹھی' لکھنو بار ہشتم' ۱۹۱۹ء ص ۱۱۷

۵-سہ ماہی صحیفہ' لاہور جولائی تا ستمبر ۱۹۸۷ء مضمون سید نور محمد قادری' ص ۴۹

۶-بیاض قادری مملوکہ سید نور محمد قادری' ص ۴۹

۷-ایضاً

۸-ماہنامہ العزیز بہاولپور' مئی ۱۹۴۱ء، ص ۳۸

۹-ایضاً' جون ۱۹۴۱ء' ص ۴

۱۰-دبیر عجم از مولانا اصغر علی روحی' لاہور بار اول، ۱۹۲۸ء، ص ۴۰۴

۱۱-ہفت روزہ رضوان' لاہور، مئی ۱۹۵۰ء' ص ۸

۱۲-دیوان نظم طباطبائی' حیدرآباد دکن، ۱۹۳۸ء، بار اول، ص ۳۲۳

۱۳- حیات النذیر' مرتبہ افتخار عالم مارہروی دہلی' ۱۹۱۲ء، بار اول، ص ۶۶۱

۱۴-ایضاً'

۱۵-نظم وجاہت' تصنیف وجاہت حسین وجاہت، جلد اول' ۱۹۱۴ء بار اول، ص ۱۱۲

۱۶-ایضاً' ص ۱۱۳' نظم وجاہت سن ۱۹۱۴ء میں چھپا اور چھپتے ہی حکومت انگلشیہ نے اسے ضبط کر لیا۔ اب اس کے خال خال نسخے بڑی لائبریوں میں شاید موجود ہوں۔

۱۷-مدائح و مراثی' مطبوعہ لاہور' سن ندارد' ص ۱۱۱

۱۸- بیاض قادری مملوکہ سید نور محمد قادری

۱۹-ایضاً

۲۰-خفتگان کراچی از پروفیسر محمد اسلم لاہور، بار اول ۱۹۹۱ء، ص ۳۴۲

۲۱-دیوان ثاقب از مرزا ثاقب لکھنوی ۱۹۳۶' بار اول ص ۷۶

۲۲-نظم وجاہت' ص ۱۰۴

۲۳-سہ ماہی اردو نامہ' کراچی' جنوری ۱۹۷۰، مضمون ابراہیم خلیل، ص ۱۰۰

۲۴- داغ مرتبہ محمد نور اللہ نوری' حیدرآباد دکن' بار اول، ۱۳۵۵ھ، ص ۱۹۹

۲۵-مثنوی مولانا روم' لکھنو بار اول ۱۸۶۶' ص ۶۳۴' یہ مثنوی معنوی کا مقبول ترین ایڈیشن ہے۔ اس کے بعد ہندوستان میں جتنے بھی ایڈیشن چھپے ہیں ان میں سے بیشتر اسی کی نقل ہیں۔ قاضی تلمذ حسین صاحب نے اپنی معرکتہ الاراء تالیف مرأۃ المثنوی میں اسی ایڈیشن کے صفحات کا حوالہ دیا ہے۔

۲۶-صحیفہ زرین - دیوان ضیاء الدین احمد نیر رخشاں' دہلی' بار اول ۱۹۱۵ء، ص ۱۵۸

۲۷-قطب العارفین از سید نور محمد قادری' مطبوعہ لاہور' ۱۹۸۵' ص ۵۰

Marfat.com

۲۸- ارمغان حق از سید محفوظ علی صابر القادری بریلوی، واہ کینٹ ۱۹۸۰ء، ص ۴۴
۲۹- ایضاً، ص ۴۶
۳۰- ایضاً، ص ۵۲
۳۱- نقش سویدا از حکیم محمد نبی خان جمال سویدا لاہور ۱۹۷۱ء
۳۲- ایضاً
۳۳- ایضاً
۳۴- ایضاً
۳۵- ایضاً
۳۶- دیوان جوشش مرتبہ قاضی عبدالودود انجمن ترقی اردو ہند دہلی ۱۹۲۱ء، ص ۲۴۰
۳۷- تذکرہ اکابر اہل سنت پاکستان از محمد عبدالحکیم شرف قادری لاہور ۱۹۷۶ء، ص ۳۸۳
۳۸- ایضاً، ص ۱۴۳
۳۹- ایضاً، ص ۹۴
۴۰ ایضاً، ص ۴۰۰
۴۱- شعر حسن از نظیر لدھیانوی (اصغر حسین خاں نظیر لدھیانوی) رضا پبلی کیشنز لاہور ۱۹۷۸ء، ص ۸۳
۴۲- ایضاً
۴۳- ایضاً
۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷ ایضاً
۴۸- محاسن کنز الایمان از ملک شیر محمد اعوان، مرکزی مجلس رضا لاہور ۱۳۹۷ھ، ص ۷۶
۴۹- جہان رضا مرتبہ محمد مرید احمد چشتی ایضاً، ۱۴۰۱ھ، ص ۲۶۲
۵۰ دیوان غالب اردو، مطبع نامی نونشی نول کشور واقع کانپور ۱۳۰۴ھ جولائی ۱۸۸۷ء
۵۱- تذکرہ اکابر اہل سنت پاکستان، ص ۳۰۲
۵۲- زندہ رود (حصہ اول) ڈاکٹر جاوید اقبال لاہور ۱۹۷۹ء، ص ۲۸۴
۵۳- ایضاً حصہ سوم، ص ۵۴۹
۵۴- ایضاً حصہ دوم، ص ۲۰۶
۵۵- ماہنامہ ضیائے حرم لاہور اپریل ۱۹۷۵ء، ص ۴۴ مضمون سید نور محمد قادری
۵۶- نیرنگ خیال لاہور ستمبر ۱۹۵۱ء ص ۵۱ مضمون مثنوی صیدیہ حضرت اطہر ہاپوڑی
۵۷- شام و سحر (نعت نمبر) (نقش ثانی) لاہور جنوری - فروری ۱۹۸۲ء ص ۲۹۱۔

☆☆☆

Marfat.com

گر گوہر طاعتت نہ سفتم ہرگز
ور گرد گنہ رخ نہ رفتم ہرگز
نومید نیم ز بارگاہ کرمت
دانی، کہ یکی را دو نہ گفتم ہرگز

(عمر خیام)

Marfat.com

جائزہ کتب

Marfat.com

گل محمد ناطق مکرانی کا مجموعۂ کلام "جوہر معظم"

ڈاکٹر سلطان الطاف علی☆

زیرِ نظر کتاب بلوچستان کے اٹھارہویں صدی کے عظیم شاعر گل محمد ناطق مکرانی کا مجموعہ کلام ہے جو بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کے زیرِ اہتمام جو ۱۹۶۹ء میں طبع ہوا۔ اس کی ترتیب و نظرِ ثانی ڈاکٹر انعام الحق کوثر کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ کتاب ۱۶۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا فاضلانہ مقدمہ کتاب کے تعارف کے لیے اہمیت کا حامل ہے۔ کاغذ عمدہ ہے۔ جلد بندی کی گئی ہے۔ کتاب کا سائز میانہ اور کتابت خط نستعلیق میں ہے۔ البتہ کہیں کہیں اشعار اور جملوں کے درمیان خلا نظر آتا ہے مگر کوئی حرف غائب نہیں۔ بعض مقامات پر نقاط اور مدیں کتابت میں سہو ارہ گئیں ہیں۔ ڈاکٹر کوثر نے کتاب حاضر کی ترتیب و تدوین وغیرہ کے سلسلے میں بیسیوں کتب و رسائل کے علاوہ جواہر سنگھ جوہر کے مرتب کردہ جوہر معظم (مطبوعہ لکھنؤ، ۱۲۷۷ھ) کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کلام ناطق کے آغاز سے پہلے چند صفحات کی نثری تحریر میں میرزا گل محمد ناطق کے شاگرد جواہر سنگھ جوہر لکھنوی کی جوہر معظم کا تعارف کراتے ہیں۔ اس نثر میں چھٹی صدی ہجری کی مشکل پسندی کا سا انداز پایا جاتا ہے۔ کلام کے پہلے حصہ میں قصائد و مدائح ہیں۔ دوسرا حصہ غزلیات و رباعیات پر مشتمل ہے۔ آخر میں ناطق مکرانی کے مکتوبات ہیں۔

ناطق مکرانی کے قصائد دیکھنے سے محسوس ہوتا ہے جیسے وہ فرخی کی پیروی کر رہے ہوں، مگر بات نہیں بنی، البتہ قصیدہ میں قدما کے مسلک کا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ تشبیب، گریز، مدح، تقاضا، اور دعا سب شامل ہیں۔ اولین قصیدہ میں نظیری کی سی باریک بینی موجود ہے۔ سبکِ ہندی کارفرما ہے۔ ملاحظہ ہو مدحیہ میں کہتے ہیں:

☆ [illegible]

Marfat.com

تا قیامت متصل داد گر بازی دھد
یکرہ از بحر کف جود تو گر خیزد سحاب

واجد علی شاہ کے حضور میں قصیدہ کا پہلا حصہ یعنی تشبیب قابل تعریف ہے۔ ناطق کہتے ہیں:

زمانہ بسکہ ز نوروز عشرتستان ست
الم شگفتہ و اندوہ نیز خندان ست
بہ تیغ سبزہ مسخر نمود روی زمین
کنون سراسر آفاق از بہاران ست

نواب امین الدولہ کے قصیدہ میں تقاضا نہایت خوب ہے۔ کہتے ہیں:

گر چنین تربیت اہل سخن خواھی کرد
لکھنؤ غیرت شیراز و صفاہان گردد

حسین آباد کی مدح میں یوں رقمطراز ہوتے ہیں:

بھر کجا بود نامرادی اندر دھر
بآن خجستہ حرم چون رسد رسد بہ مراد

راجہ جوالا پرشاد کے قصیدہ میں لکھنؤ کے سفر کا اشارہ ملتا ہے اور اس میں تقاضا بھی شامل ہے:

لکھنؤ جنت است ہان مپسند
کہ برین بی گناہ سقر گردد
آنچنان کن کہ در یم کرمت
غرق از پای تا بسر گردد

ایک غزل کے مقطع میں ہندوستان کو [؟] ہجرت کا اظہار موجود ہے' کہتے ہیں:

صبا از جانب ناطق سلامی خاک مکران را
کہ من چون غنچہ دل در گلشن ہندوستان بستم

حسین آباد کی مدح میں ناطق مکرانی کی شاعرانہ تعلّی دیکھیے:

Marfat.com

درین زمانہ من آن شاعرم کہ نتوان یافت
نظیر من بہ سخن در قلمرو ایجاد

ایک غزل کے مقطع میں ناطق کی قلندرانہ گفتار ملاحظہ ہو:

بیا بہ مملکت ہمت بہ بین ناطق
کہ من تونگر و این منعمان فقیر من اند

محمد علی شاہ کی مدح سرائی کرتے ہوئے ناطق انکساری اور یاسیت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

نیستم شاعر و ہان شعر نمیدانم چیست
گو برین زار زند قہقہہ سلمان و کمال
نہ رفیقی کہ کند پاک سر شکم از چشم
نہ شفیقی کہ فشاند ز دلم گرد ملال
عاجزی مثل من اکنون نتوان یافت بدہر
گر بہ بیزند جہان را ہمگی در غربال

اسی طرح ایک غزل کے مقطع میں ان کی انکساری دیدنی ہے۔ انداز بھی نرالا ہے اور خیال میں جدت نظر آتی ہے:

گذاشتم روش سرکشی کنون ناطق
بہ خاکساری من خاک افتخار کند

واجد علی شاہ کی مدح میں بہاریہ اشعار خوب کہے ہیں۔ منظر نگاری بھی قابلِ تعریف ہے:

بیا بدشت کہ جوشید لالہ و سنبل
خوش است سیر گلستان بی در و دیوار
نمودہ اند بہم اتفاق سبزہ و گل
بدلربائی مردم چو خط و عارض یار
چو موسمیست کہ آشفتگی بدام برد
ز وضع طرہ دستار شیخ زلف نگار

سلطان العلماء کی صفت میں قصیدہ گو ہوتے ہوئے گریز کا انداز اور رنگ

Marfat.com

تغزل بیک وقت قابل توجہ ہیں:

گفتم کہ ای امید کجا میروی چنین
گفتا بدرگہی کہ بود کام را مدار
گفتم کہ جز تو نیز بدان در رود کسی
گفتا کہ جوق جوق خلایق زھر دیار
گفتم چہ می دھند بکس گفت کام دل
گفتم کہ چند گفت فزون از حدوشمار
گفتم کہ کیست صاحب آن بارگاہ گفت
یکتای کائنات خداوند روزگار

محمد علی شاہ کے قصیدہ میں غیرت اور مجبوری کا امتزاج دیکھیے:

من کہ در کاسہ فغفور نخوردم از ننگ
می خوراند فلکم سفلہ ام اکنون بہ سفال

مطالعہ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ بلوچستان کا یہ گوھر شہوار ناطق مکرانی اپنے علاقے کے عوام اور امراء کی بے حسی اور کورذوقی سے دل برداشتہ ہو کر لکھنؤ اور بنگالہ کے نوابوں کی خوشامد و مدح سرائی پر مجبور ہوا۔ لیکن لکھنؤ جیسے علم وادب کے گہوارہ میں بھی اس کی خاطر خواہ پذیرائی نہ ہوئی یہاں تک کہ وطن واپس آ کر وہ دوبارہ تنگدستی کا شکار ہو جاتا ہے اور نوبت فاقوں تک پہنچ جاتی ہے۔ اگر اس عظیم فنکار کی اپنے وطن میں قدردانی ہوتی تو بہت ممکن تھا کہ یہ اپنا قیمتی وقت اور گرانبہا فن شعر گوئی وسخندانی محض مبالغہ آرائی اور خوشامدانہ مدح سرائی پر صرف نہ کرتا۔ محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت بلوچستان کے عوام فاقہ مستی کا شکار تھے۔ جیسے کہ ناطق خود کہتے ہیں:

نہ کتابی بہ بغل شان نہ قلم در کف شان
در بغل ھیزم و در دست تبر می بینم
ھمہ آفاق بنوشند گلاب و قندست
مکریان راہ ھمہ از خون جگر می بینم

Marfat.com

اور اپنے علاقہ کے حکمران کی کیفیت حال وہ خود اپنے ایک مکتوب میں بیان کرتے ہیں
''رب النوع این دیار کہ یکی از مضغہء گوشت بیش نیست میلی و شغفی جانب شعر و سخن ندارد۔''
گویا امراء حال مست تھے۔ ان حالات میں بھلا کیونکر مکران میں علم و ادب کی سرپرستی ہوتی۔ یہی وجہ تھی کہ بلوچستان اپنے ایک عظیم فنکار کو چین و آرام اور عزت کی زندگی نہ دے سکا۔ نہایت افسوس کے ساتھ محسوس کیا جاتا ہے کہ اس عظیم سخنران کا تمام کلام تلاش معاش کی فکر و سرگرانی کا مظہر ہے۔ محمد شاہ کے حضور اپنے قصیدہ میں کہتا ہے:

طمع جاہ ندارم بہ جلال تو قسم
خواہم از فکر معاشم بکنی فارغبال

ناطق فطرتاً ایک شاعر ہے یہی وجہ ہے کہ وہ مذہبی تعصبات سے بلند رہتا ہے۔ اس کا بہترین قصیدہ راجہ مان سنگھ کی مدح ہے اور اس کے بہترین مکتوبات منشی بہادر سنگھ کے نام ہیں۔ ناطق حقیقت پسند تھے۔ واعظوں اور ریاکاروں سے ان کی کبھی نہ بن آئی۔ حافظ شیرازی کی طرح غزل میں بھی زہاد سے نوک جھونک ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

آب شد ز آتش می تیغ زبانم یارب
واعظ ھرزہ درا را بچہ خاموش کنم

ناطق مکرانی کی غزلیات میں سبک عراقی کا رنگ موجود ہے۔ مگر اس کے باوجود کلام پر سبک ھندی ہی کا غلبہ ہے۔ نظیری اور مخفی کا سا انداز ملتا ہے۔ کہیں کہیں حافظ کی تاثیر بھی موجود ہے مگر اسلوب میں بیحد بعد ہے۔

اس ضمن میں غزلیات سے منتخب اشعار ملاحظہ ہوں:

بر زدی برقع و فوارہ آتش گردید
از فروغ رخ تو دودکش خانہء ما
باد فارغ زنم تربیت با دھقان
آب از خویش خورد ھمچو گہر دانہء ما
سنگ در دامن کہسار نماندست و ھنوز
چشم دیوانہ ما برکف طفلان باشد

Marfat.com

سوز و سرمستی کا عالم ملاحظہ ہو:

سوخت از گرمی دیدار کسی پیکر ما
بعد ازین چشم کلیم اللہ و خاکستر ما
ہمہ از مستی ما سر اناالحق جوشد
خاک منصور ہمانا ست گل ساغر ما

ناطق دنیا میں عیش و نشاط کی زندگی ہرگز طلب نہیں کرتے:

گر چو بلبل کلبہ از خار و خس باشد مرا
کشتنی باشم اگر گلشن ہوس باشد مرا

ادائے محبوب سے نیم بسمل ہو جانے کی کیفیت نا قابل برداشت ہے:

تا بکی از سخت جانی نیم بسمل زیستن
میزنم زین بار بر تیغی کہ بس باشد مرا

فطرت میں اسقدر درد ہے کہ جو بھی عاشق پر درد کے ساتھ ایک بار تعلق رکھتا ہے وہ محبوب کے عشق میں گرفتار ہو جاتا ہے:

ہر مرغ کہ پر زد بہ تمنای اسیری
اول بشگون گرد طواف قفس ما

ان کے ہاں عشق کا مقام عقل سے بہت آگے ہے۔ جب حضرت عشق کا ورود ہوتا ہے تو عقل و خرد کا خروج ہو جاتا ہے، ملاحظہ ہو:

بیراہہ جہاندیم بمیدان فراست
عشق آمد و برتافت عنان فرس ما

ناطق کے عشق میں وہی جذبہ منصوری موجود ہے بلکہ اس کی شراب محبت کی تلچھٹ ہی ناب منصور کا جواب رکھتی ہے:

ناطق آن نشہ کہ در صاف می منصور است
میتوان یافت ز دردتہ پیمانہ ما

ایذا کشی عاشق کا شیوہ ہوتا ہے۔ آتش عشق سے تعلق ہو تو راحت طلبی بے معنی ہے:

Marfat.com

ناطق مطلب صحبت راحت طلبان را

بگریز ز دردیکہ گریزان ز دوانیست

لذت ز درد بسکہ دل زار من گرفت

ناخن زدم بداغ اگر بہ شدن گرفت

جب کوچہء محبوب کو کعبہء دل کا مقام حاصل ہو جاتا ہے تو وہی کعبہء مقصود بن جاتا ہے:

رفتم بسوی کعبہ زکوی بتان ولی

حسرت دوید از پی و دامان من گرفت

روز وصل عاشق غیور محبوب کے ساتھ رقیب کو دیکھ کر روز ہجر سے بڑھ کر پیچ و تاب کھاتا ہے:

ہرگز ای یار نیائی برمن بی اغیار

روز وصل تو بتر از شب ہجران باشد

دنیا میں حسن بھی مظلوم ہے۔ ناطق اس سے آگاہ ہیں اور کس قدر خوب پیرایہ میں گویا ہوتے ہیں:

گہ بچہ گاہ بزندان فگند یوسف را

حسن از حد چو گذشت آفت خوبان باشد

اس حقیقت سے کون آگاہ نہیں کہ آلائش دنیا سے جو آزاد ہوتا ہے وہی زلف محبوب کا اسیر ہوتا ہے۔ ناطق اسی بات کو کس قدر اچھے انداز میں بیان کرتے ہیں:

زدم بہ انجمن دوست لاف آزادی

بطنز گفت کہ آزادگان اسیر من اند

میخانہ محبت میں ہی زندگی اور سکون حیات موجود ہے۔ اس سے باہر سکون اور حیات کی تلاش بے سود ہے:

کنج صومعہ زاہد نشستہ پیر شدی

بی بدر نشین می کش و جوان برخیز

Marfat.com

سزای تست کہ گشتی اسیر غم ناطق
کہ گفتہ بود ترا کز درمغان برخیز

عاشق بےصبر اور غیور ہوتا ہے۔ اس عام کیفیت کو ناطق کے الفاظ میں سنیے:

هم ناصبور کردہ مرا عشق و هم غیور
هم قاصدت فرستم و هم قصد جان کنم

عاشق کے پیچ و تاب کی ایک اور کیفیت ملاحظہ ہو:

خواب دیدم کہ خورم آب حیات از دستش
تیغ می راند بہ حلقوم چو بیدار شدم

پاکیزہ قلب و نظر عشق کا خاصہ ہے۔ ہوس و عشق میں امتیاز دیکھیے:

ای بوالہوس کہ دوختہ دیدہ بر رخش
غیرت بگیر از مژہ خون فشان من

خدا تعالی کے مجبور و لاچار بندوں کی خدمت کرو۔ اسی میں جہانبانی کا راز مضمر ہے۔ ناطق کہتے ہیں:

سلطنت گر میل داری خاکساران را نواز
خدمت موری کن و خود را سلیمانی بہ بین

اب آخر میں ناطق مکرانی کے چند بہترین اشعار سے منتخبات ملاحظہ کریں جو رمز و صاف گوئی بیباکی و خوش بیانی میں بےنظیر ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے خواجہ حافظ شیرازی کی روح اٹھارہویں صدی عیسوی میں ناطق کے جسد پر درد میں آ کر اپنا نغمہ شیراز الاپ رہی ہو۔

برسر بام بیا گوشہ ابرو بنما
روزہ داران جہان منتظر ماہ تو اند
بانگی زدیم و سر انالحق شد آشکار
ما را ازین گیاہ ضعیف این گمان نبود

Marfat.com

پیالہ بر کف و محتسب ز دیر گذشت
"رسیدہ بود بلائی ولی بخیر گذشت"

اور دیکھیے کس نیچرل انداز میں وہ بات کہہ دی ہے جسے مشکل ہی سے شعر کا جامہ پہنایا جا سکتا ہے:

رشک ر آیدم وگرنہ نقابت کشودمی
دست ترا گرفتہ بہ ناصح نمودمی

کتاب کے آخری حصہ میں مکتوبات ہیں۔ گو مرزا غالب سے نہایت بے تکلفانہ تعلقات معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ان کے نام ناطق کے مکتوبات پر تکلف انداز میں ہیں۔ سب سے دلچسپ اور بے تکلفانہ خطوط منشی بہادر سنگھ کے نام ہیں۔ واجد علی شاہ سے بھی طویل خط و کتابت ہوتی ہے، مگر اس کے مقام کا ہر وقت احساس رہتا ہے۔ احترام، تکلف و تصنع کا انداز آخر تک رہتا ہے۔ منشی بہادر سنگھ سے گہرے تعلقات معلوم ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نام جو خطوط لکھے ہیں ان میں بے تکلفانہ انداز گفتگو صاف دکھائی دیتا ہے۔ سیدھی سادی نثر ہے اور اپنے حال غم کا اظہار اس طرح ہو رہا ہے جیسے راز داری سے بات ہو رہی ہو۔ منشی بہادر سنگھ کے نام ایک مکتوب میں اپنی معاشی بدحالی کا رونا روتے ہیں اس طرح "در گوشہ خمول نشستہ ام و خار حرمان در دل شکستہ، ہجوم قرض خواہان و تقاضای شدید ایشان نہ بمثابہ ایست کہ قدم بیرون خانہ توانم گذاشت، دیروز دیگ و چمچہ و آفتابہ کہ باقیماندہ دولت لکھنو بود آنہم بفروش رفتند۔"

ڈاکٹر کوثر کتاب مذکورہ کے مقدمہ میں خوب کہتے ہیں کہ "بیچارہ فنکار مقہور و مغلوب ہے۔ مادہ پرست دنیا اس کے موتیوں کو خاک میں رولتی ہے۔ وہ بھوکا ہے، ننگا ہے، محبوس ہے، مقید ہے اور رو رہا ہے۔ بے تحاشا رو رہا ہے...... لیکن آفرین ہے اس کے احساس عالیہ پر کہ فانوس خیال بجھنے نہیں دیتا۔ روتا ہے ہنستا ہے، لیکن چلتا رہتا ہے۔ وہ صدیوں سے ایسا ہے۔ یہ مے نوش، یہ بلانوش، یہ رند، یہ عاشق، یہ فنکار۔" اور منشی بہادر سنگھ کے نام ناطق کے مکتوب کا درج بالا اقتباس اس احساس کا بین ثبوت ہے۔

☆☆☆

Marfat.com

جام وفا - ایک جائزہ

فائزہ زہرا مرزا☆

میرے لیے یہ بات باعث فخر اور مسرت ہے کہ مجھے ایک پروقار شخصیت کے ایک علمی فن پارے پر اظہار خیال کا موقع فراہم ہوا ہے۔ مقصود جعفری صاحب سے میری دو ملاقاتیں ہوئی ہیں اور میں ان کی شخصیت سے بطور کلی شناسائی تو نہیں رکھتی لیکن بہرصورت ان دو ملاقاتوں میں ان کی شخصیت کا کچھ کچھ اندازہ ہو گیا ہے۔ میں پچھلے دنوں جناب ڈاکٹر سعید بزرگ بیگدلی کے پاس اپنے کسی کام کے سلسلے میں آئی تھی اور جاتے وقت انہوں نے مجھے بطور ہدیہ ایک کتاب جام وفا کے عنوان سے پیش کی اور کہا کہ یہ مقصود جعفری صاحب کے اشعار کا نیا مجموعہ چھپا ہے۔ گھر آ کے میں نے استاد کے دیے ہوئے تحفے کو جب ایک نظر دیکھا تو مجھے اس کتاب کے اشعار اور غزلیں نہایت پرکشش اور آسان فارسی میں معلوم ہوئیں۔ چنانچہ پڑھنے کا اشتیاق بڑھا اور میں نے تھوڑی ہی دیر میں تقریباً پوری کتاب پڑھ ڈالی۔ اس بات سے آپ یقیناً اندازہ لگا چکے ہونگے کہ یہ کتاب کس قدر جاذبیت رکھتی ہے۔

اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود جعفری صاحب کے علم و ادب کے ساتھ اسی لگاؤ نے ان کی شخصیت کو اور نکھارا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ غزل کے شاعر کا مقام متعین کرنے کے لیے تخلیق کے معیار اور شاعر کے مجموعی رویے کا تجزیہ لازمی ہے۔ محض اشعار کی تعداد کو معیار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مقصود جعفری صاحب کی علم دوستی اور علم پروری کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب جام وفا کا آغاز ہی ابوتراب امیر المومنین حضرت علیؑ کی مدح سرائی سے کیا ہے۔ باب مدینۃ العلم سے عقیدت کے اظہار میں ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

نور خدا ز جلوهٔ روی تو داشتم
در دست عشق جام نکوی تو داشتم
یک جام بادهٔ ساقی کوثر بہ من بده
رندم امید می ز سبوی تو داشتم

☆ استادیار زبان فارسی، مارگلہ کالج برائے خواتین، اسلام آباد

Marfat.com

ای مرتضی علیؑ لقبت بوتراب شد
من بوی خوش تراب ز کوی تو داشتم
روشن چراغ دین محمدؐ ز فکر تو
من غنچہ ہای عشق' زبوی تو داشتم

وہ اس بات سے بخوبی آگاہ ہیں کہ حضرت علیؑ کی ذات ہی وہ ذات ہے جس سے انوار الٰہی حاصل ہوتے ہیں، وہی ساقی کوثر ہیں اور نبوت محمدیؐ کے امین ہیں۔ کتاب جام وفا کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کے دل میں عشق اور زندگی کا احساس انتہائی شدید ہے۔ غزلوں میں انہوں نے ایک ایسی قوت کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے جو دنیا کے ہر حصے میں عوام کی جدوجہد کی صورت میں حکمران طبقوں کے خلاف لڑ رہی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

جہانِ کم نظر را' من نظر دادم
شب تاریک را نور سحر' دادم
گروہ کورچشمان را بہ یک آہی
نشان منزل و ذوق سفر دادم
زجور غربیان ھرگز نمی ترسم
بہ جنگ ظلم آنان جان و سر دادم

ان کی غزلوں میں سلاست' مضمون آفرینی اور تغزل کی روح جھلک رہی ہے اور اشعار میں حسن اور صداقت کے جلوے نظر آتے ہیں۔ ان کو اظہار کی بہترین قدرت اور انتخاب الفاظ کا سلیقہ حاصل ہے۔ وہ فارسی شعر و ادبیات سے بطور کلی مانوس ہیں۔ ان کے کلام میں پختگی اور مشاقی پائی جاتی ہے۔ ان کی غزلوں کے عنوانات ہیں محبت، نخل محبت' چشم عشق' شعلہ ہای عشق' سرزمین عشق ، ریگزار عشق' جام عشق وغیرہ وغیرہ۔ ان کے یہاں موضوعات کا تنوع اور موضوع کو نبھانے کا انداز' ان کی ژرف نگاہی' علمی وسعت اور فنی دسترس کا پتہ دیتے ہیں۔ چونکہ انہوں نے حافظ' سعدی، مولانا روم، عراقی، خسرو اور اقبالؒ جیسے عظیم شعراء کی شاعری کا بخوبی مطالعہ کیا ہے۔ اسی لیے انہوں نے قدیم استادانہ اسالیب کا دامن نہیں چھوڑا اور جدیدیت کے گلستان سے بھی پھول ہی پھول حاصل کیے ہیں۔ وہ اپنی ایک غزل ''عشق بتان'' میں اپنے محبوب سے اسی انداز میں مخاطب ہیں۔ اس غزل کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

Marfat.com

باز فصل گل رسیدہ ،تو کجایی جان من
آمدم من دل طپیدہ ، تو کجایی جان من؟
باامید وصل تو تریاق غمخواران شدم
مارہجرانت گزیدہ تو کجایی جان من؟
عاشق سرگشتہ ہستم، دل شدہ نالان وزار
کوچہ و بازار دیدہ تو کجایی جان من؟
جعفری را دل شدہ چون قصہ، عشق بتان
ہر کس و ناکس شنیدہ تو کجایی جان من؟

مقصود جعفری کے نزدیک عشق ومحبت ہی ہر دکھ اور پریشانی کا مداوا ہے۔ چنانچہ اگر وہ کسی غزل کی ابتداء ناامیدی سے کرتے ہیں تو اس کا انجام عشق اور امید ہی پر کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

زندگی مشکل بود ای دوستان
از طریق عشق آسان می شود

وہ محبوب کے عشق میں اس قدر ڈوبے ہوئے معلوم ہوتے ہیں کہ ان کی ہر بات ماننے کو دل و جان سے راضی ہیں اور اس کے لیے کچھ بھی کر گذرنے سے دریغ نہیں کرتے۔

ہر چہ می گویی برایت می کنم
شاعرم با تو محبت می کنم
جعفری را نیست تاب گفتگو
ہر چہ می گویی اطاعت می کنم

مگر انکا یہ عشق اور وارفتگی سطحی نہیں اور نہ ہی حباب کی مانند جلد ختم ہو جانے والی ہے، بلکہ ان کا عشق، ذات خداوندی سے ہے جسے دنیا کی کوئی طاقت ختم نہیں کرسکتی۔ انہیں یقین کامل ہے کہ محبوب کے پاس ہی ان کے درد کا درمان ہے' وہ ایک عاشق صادق کی طرح دعوت دیتے ہوئے کہتے ہیں:

جانم بیا کہ در رہ عشق خدا زدیم
در گلشن محبت دلہا سفر کنیم
کوشش گران عشق ہمہ غمگسار ما
روشنگران گلشن حق را نظر کنیم

Marfat.com

جانا شراب عشق خدا، از خدا بگیر
شو معتکف بہ درگہ حق و شفا بگیر

ان کے اشعار سے یہ بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ایک مردِ مومن کی طرح اس پرفریب دنیا کو انسانوں کی مستقل رہائش گاہ تصور نہیں کرتے اور زندگی کے کاروان کو اس دنیا میں عارضی تصور کرتے ہیں جہاں انسانوں کو دوسروں کے لیے باعث راحت و آرام ہونا چاہیے نہ کہ ان کے لیے باعث تکلیف اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے اشعار کو دوسروں کے دکھوں کا مداوا جانتے ہیں۔ بقول ان کے:

درین دشت غربت چو من پا نہادم
ھمارہ تپیدہ دل و غمگسارم
مہر دل ای جعفری آسان مدہ از دست خود
کاروان زندگی شد چون حباب زندگی

مقصود جعفری صاحب ایک کشادہ فکر شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ مظلوم اور غم زدہ عوام کے لیڈر بھی ہیں، لہٰذا ان کے دل میں مظلوموں اور بے کسوں کا درد بہ درجہ اتم موجود ہے۔ وہ ایک دردمند رہنما کی طرح استعماری طاقتوں اور ظلم و جور کے خلاف لوگوں کو جھنجھوڑنے اور انہیں خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لیے ہر وقت کوشاں ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کی آواز دنیا کے ہر گوشے تک پہنچے اور ان کی آتش نوائیوں سے ایک انقلاب برپا ہو جائے۔ وہ اپنی اس خواہش کو اس انداز میں بیان کرتے ہیں:

از آہ آتشین ھمہ شب را سحر کنم
تا خفتگان بی خبری را خبر کنم
ای دل ز من مپرس از احوال زندگی
من خواہتم کہ خاک را رشک گہر کنم
من ذرہ ھای خاک سیہ را قمر کنم
باید کہ من بہ ناہ محبت بسر کنم
باید کہ بشنوند پیام فقیر را
از سر اہل ھوش زمین را خبر کنم

Marfat.com

بایدکہ بشکنیم غرور ستمگران
من زین سبب ز مجلس شاھان حذر کنم
باید کمک کنیم یتیم و یسیر را
ھموارہ من بہ سوی یتیمان نظر کنم
باید محبت تو شود جعفری ظہور
ھموارہ من بہ راہ محبت سفر کنم

میری دعا ہے کہ مقصود جعفری صاحب علم و ادب کی خدمات اسی آتشین شوق و جذبہ سے کرتے رہیں اور اپنے دوستوں اور شائقین علم و ادب کو اپنے زرین افکار سے نوازتے رہیں۔

☆☆☆

Marfat.com

منظومات

Marfat.com

لا الٰہ الا اللہ

شعیب جاذب

شہید حق کی صدا، لا الٰہ الا اللہ
پیام کرب و بلا، لا الٰہ الا اللہ
خدا ہے چہرۂ فطرت، رسول آئینہ
حسین عکس وفا، لا الٰہ الا اللہ
سر صلیب، حرم غار ثور، کرب و بلا
مقام ذکر خدا، لا الٰہ الا اللہ
جفا کی تیغ ہو یا نیزۂ ستم کی انی
بنائے اشک عزا، لا الٰہ الا اللہ
حسینیت کی رگوں میں رواں ہے خون علی
لبوں پہ صبح و مسا، لا الٰہ الا اللہ
گلاب مہکے ہوئے ہیں شہید کے تن پر
گلوں کی سرخ قبا، لا الٰہ الا اللہ
امام حق کسی باطل کی کیا کرے بیعت
نوشت دین ہدا، لا الٰہ الا اللہ
گلوئے صبر پہ خنجر چلا ستمگر کا
لہو میں ڈوب گیا، لا الٰہ الا اللہ
بریدہ سر کی تلاوت پہ کان دھر تو سہی
کہ آ رہی ہے صدا، لا الٰہ الا اللہ
فروغ پاتی رہی شام جہل میں ظلمت
سحر کی بانگ درا، لا الٰہ الا اللہ
یزید وقت کسی سامری سے کم تو نہ تھا
حسینیت کا عصا، لا الٰہ الا اللہ
دہان دین پہ ظالم کا شرمناک ستم
حسین پڑھتا رہا، لا الٰہ الا اللہ
بریدہ سر کو اٹھایا ستم طرازوں نے
عروج پر ہے انا، لا الٰہ الا اللہ
تو کربلائے معلٰی سے زندگی لیتا
خمیر خاک شفا، لا الٰہ الا اللہ

Marfat.com

کتاب دین مبیں پر تری نظر ہی نہیں
نصاب دشتِ وفا' لا الہ اللہ
حسینیت سے ستم کر رہے ہیں اہل ستم
حسینیوں کی نوا لا الہ الا اللہ
عزائی چشم کے حلقے میں ماتم زنجیر
ٹپکتے خوں نے پڑھا' لا الہ الا اللہ
علم سروں کے اٹھاؤ رہ صداقت میں
زباں سے گونجے صدا' لا الہ الا اللہ
یہ اور بات کٹیں گردنیں بہتر کی
جہاں میں بچ تو گیا' لا الہ الا اللہ
دیار شام میں ہیں بیٹیاں محمدؐ کی
ردائے آل عبا' لا الہ الا اللہ
کریں وہ حکم مودت کا تجزیہ جاذب
ہو جنکی فکر رسا' لا الہ الا اللہ

☆☆☆

Marfat.com

سجدہ آخر

نجم الحسن جعفری

پھر چاند نے دیکھا ہے زہراؑ کے گھرانے کو
مشغول ہوئی امت اس گھر کے مٹانے کو

آجایئے ہو جائے پھر مجلس غم برپا
یہ فرش بچھا ڈالا ہم نے تو بچھانے کو

سر نوک سناں پر ہے اور قرآں کی تلاوت ہے
کس شان سے نکلے ہیں اسلام بچانے کو

آنکھیں تو ذرا کھولو بابا یہ سکینہ ہے
آئی ہے لہو بہتا رخسار دکھانے کو

خیمہ پہ کھڑی ہوں میں ہاتھوں میں لیے کاسہ
آئیں گے چچا میرے کب پانی پلانے کو

زینبؑ ہیں کھڑی تنہا اور شام غریباں ہے
اب رہ گیا کیا باقی اس گھر میں لٹانے کو

آجایئے اب بابا کربل کا ہے ویرانہ
شبیرؑ چلے پھر سے اک لاش اٹھانے کو

وہ سجدۂ آخر اور وہ شکر خدا شہہؑ کا
بھولے گا نجم کیسے وہ وقت زمانے کو

☆☆☆

Marfat.com

انقلاب ایران کا

(قطعات)

تحسین جعفری (مرحوم)

معجزہ تھا، معجزہ اک، انقلاب ایران کا
قصر باطل کو کیا صد پارہ جس نے سر بہ سر
ملت خوابیدہ جاگی لے کے کروٹ یک بہ یک
مٹ گیا اک حاکم سفاک و ظالم، بدگہر

O

بتکدے جور و جفا کے منہدم سب ہو گئے
دبدبہ شاہی کا، رعب و داب اور فرعونیت
آن واحد میں مٹا، حرف غلط کی طرح سب
تاج شاہی، کروفر اور عز و جاہ و منزلت

O

کہتی ہے دنیا خمینی جس کو اک بطلِ جلیل
انقلاب ایران میں لایا وہ مرد باصفا
حق نگر، حق دوست، تحسین اور مردِ حق شناس
بایقیں تھا نائب برحق امامِ عصر کا

☆☆☆

Marfat.com

چھوٹی قوموں کا راہبر

عظیم الوقار فرحان

وہ اہل شرق کے دل کی دھڑکن
وہ فکر ہائے کہن کا دشمن
مثال ماہ منیر روشن
سنہری سوچوں کا ایک مسکن
وہ جس کا ہر لفظ زندگی ہے
وہ جس کا پیغام آگہی ہے
وہ جس کے افکار فاضلانہ
وہ جس کا اظہار عاشقانہ
وہ آشنائے درونِ خانہ
کہ جس کے تابع ہوا زمانہ
وہ روشنی کا پیامبر ہے
وہ چھوٹی قوموں کا راہبر ہے
ہے اس کا باطن ہی اس کا ظاہر
وہ ہر گرہ کھولنے کا ماہر
وہ اک مفکر وہ ایک شاعر
وہ خطۂ پاک کا مصور
جو چاہتے ہو تم اپنی منزل
کرو اسے زندگی میں شامل

☆☆☆

Marfat.com

هرگز دل من ز علم محروم نہ شد
کم بود اسرار کہ مفہوم نہ شد
ہفتاد و دوسال فکر کردم شب و روز
معلومم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد
(عمر خیام)

Marfat.com

نئی کتابیں

Marfat.com
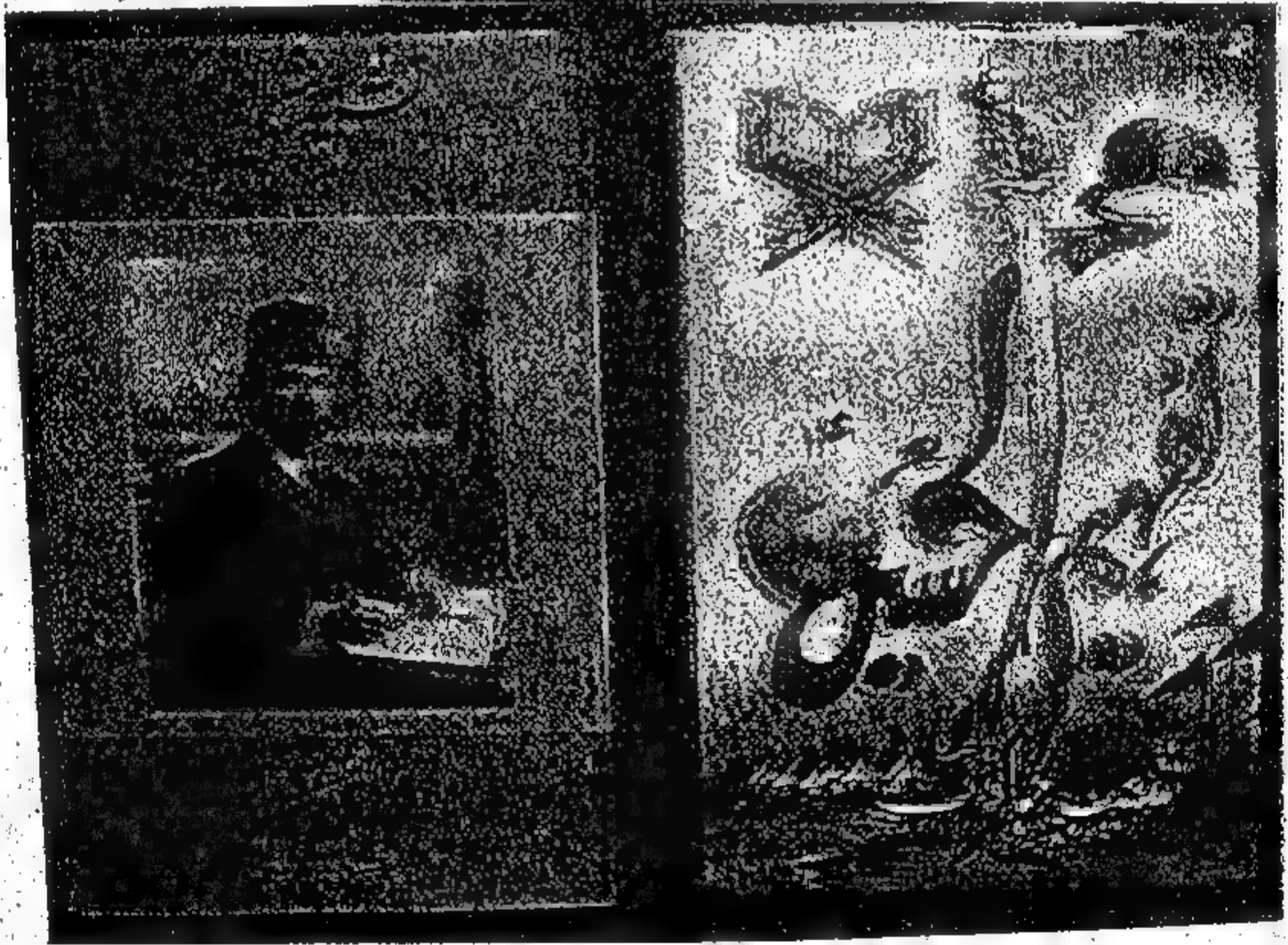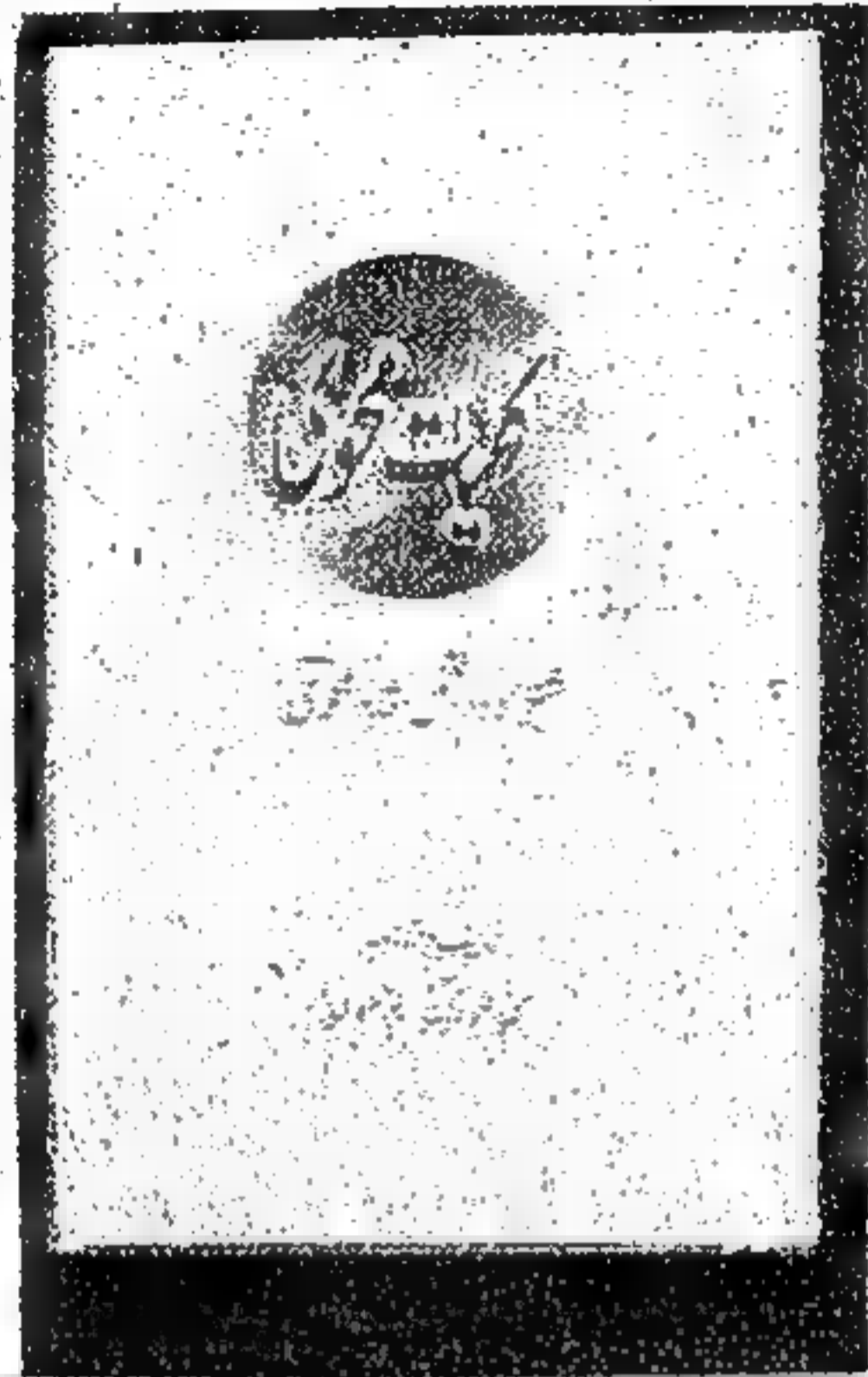
تبصرہ کتب

- نام کتاب: **کلیات محوی**
- تالیف و ترجمہ: محمد عرفان چترازی
- قیمت: =/۱۲۵

محمد عرفان چترازی نے شہزادہ تجمل شاہ محوی کے فارسی کلام اور اس کے اردو ترجمہ کو کتابی شکل میں پیش کر کے تاریخ چترال کے ایک باب کو زندہ کر دیا ہے۔ زیادہ تر کلام، جس میں حمد و نعت کے علاوہ غزلیات، مخمسات، واسوخت، مستزاد، رباعیات، نظم، قطعات اور فرد شامل ہیں، فارسی زبان میں ہے جبکہ کتاب کے آخری چند صفحے چترازی زبان کے اشعار بمع اردو ترجمہ کے لیے مخصوص ہیں۔ کتاب پر ڈاکٹر عنایت اللہ فیضی، گل نواز خاکی، عبدالمسعو د پنجشیری نے دیباچے اور تقریظات لکھی ہیں۔ کتاب محوی کے زمانے کی جو چترال میں علم و ادب کا سنہری دور تھا، آئینہ دار ہے۔ شہزادہ محوی نے علم و ادب کے دلدادہ اور صاحب قلم شخصیت ہونے کے ناتے سے قصیدۂ امالی کی شرح بھی شرح امالی کے عنوان سے لکھی جو ۱۸۴۳ میں دہلی سے شائع ہوئی۔ آپ اپنے اشعار میں حافظ شیرازی، حکیم سنائی، مولانا روم اور منصور حلاج سے خاصے متاثر نظر آتے ہیں۔ کلام تخیل کی بلند پروازی، قوت مشاہدہ، اور شعری لطافتوں اور نزاکتوں کا مرقع ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ محمد عرفان چترازی کا ترجمہ بھی سلیس اور فنی طور پر خوب ہے۔

کتاب کے آخر میں تجمل شاہ محوی کا شجرہ نسب دیا گیا ہے، جو امیر تیمور سے جا ملتا ہے۔ یہ کتاب پاکستان میں فارسی گوئی کی تاریخ سے متعلق کتابیات میں ایک حوصلہ افزا اضافہ ہے۔ ■

- نام کتاب: **تفہیم الحسین (ع)**
- سال اشاعت: ۱۹۹۹ء
- شاعر: شعیب جاذب
- قیمت: =/۲۵۰ روپے
- ملنے کا پتہ: بزم علم و فن پاکستان، ۱۱۔ شان پلازہ بلیو ایریا، اسلام آباد

میر تقی میر ہوں یا مرزا سودا، میر انیس ہوں یا دبیر، جوش ملیح آبادی ہوں یا رئیس امروہوی، دامن اردو نواسہ رسول حسین اور کربلا کے معرکہ حق و باطل کے رثائی اور عقیدتی ادب سے معمور ہے۔

Marfat.com

تفہیم الحسین اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو اپنی ادبی قدر و قیمت کے ساتھ ساتھ عقیدت کے جواہر سے مالا مال ہے۔ شعیب جاذب کے رشحات قلم سے مزین یہ ادب پارہ تاریخ کربلا سے متعلق ادبیات میں ایک نیا اور قابل قدر اضافہ ہے۔ اس کتاب میں نہایت مدلل انداز میں شعری پیرائے میں اسلام کے بنیادی عقائد کے حوالے سے قرآن کریم، امام حسین اور واقعہ کربلا کی تشریح کی گئی ہے۔ پہلا حصہ قرآن مجید سے مخصوص ہے۔ اس میں قرآن کا تعارف شعری زبان میں نہایت نفاست سے کیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں قرآن اور حسین کے موضوع پر اور تیسرے حصے میں رسول اکرم (ص) اور حسین (ع) اور چوتھے میں معارف حسین (ع) پر بحث کی گئی ہے۔ پانچویں حصے کا عنوان جگر لخت لخت ہے جبکہ چھٹے حصے میں کردار اباطیل کو واضح کیا گیا ہے اور آخری حصے میں پیغام حسین (ع) کا مختصر شعری تعارف کرایا گیا ہے۔ شعیب جاذب نے امام حسین (ع) کے کردار کی آفاقیت کو جس لطیف انداز میں پیش کیا ہے وہ انھی کا حصہ ہے اور بقول خالد اقبال یاسر مدح حسین اور نوحہ خوانی میں شعیب نے زمانی و مکانی تفریق مٹادی ہے اور ان کے زمانے کو عہد حاضر کی کربلاؤں سے مربوط کر دیا ہے۔ ■

☐ نام کتاب: نشید شیراز

☐ مرتب: پروفیسر جعفر بلوچ

☐ قیمت: ۱۰۰/= روپے

☐ ملنے کا پتہ: الحسن اکادمی، ۸ غزالی پارک، نزد وحدت کالونی، لاہور

یہ کتاب مولانا ظفر علی خان کے فارسی کلام کا نایاب اور قابل قدر مجموعہ ہے جسے پروفیسر جعفر بلوچ نے مرتب کیا ہے۔ مولانا ظفر علی خان اسلامی ہند کی تاریخ کے ان اکابر میں شامل ہیں جنہوں نے فارسی شعر و سخن کا اثاثہ اپنے آباء سے میراث میں پایا تھا اور انہیں اس بات کا شدید احساس تھا کہ فارسی زبان و ادب کا چلن گھٹنے سے لہجہ، کلام اور تحریر و تقریر میں وہ پہلی سی لطافت و عذوبت باقی نہیں رہی۔ ان کا تمام کلام اسلامیان ہند کی تاریخ و ثقافت کا خوبصورت مرقع ہے۔ نشید شیراز میں مولانا ظفر علی خان کا متفرق رسالوں اور مجلوں میں بکھرا ہوا کلام یکجا کیا گیا ہے۔ کتاب پر پروفیسر ڈاکٹر تحسین فراقی، ڈاکٹر سید محمد اکرم اکرام اور ڈاکٹر آفتاب اصغر نے دیباچے لکھے ہیں۔ کتاب کے چار حصے ہیں۔ تجلیات میں نعت نبی کریم (ص)، ''اعترافات'' میں بعض تاریخی شخصیات بشمول آغا محمد خان خامس، امیر حبیب اللہ خان، غازی امان اللہ خان، مولانا شبلی نعمانی وغیرہ پر منظومات، ''تعریضات'' میں ملی امور پر اظہار نظر شامل ہے۔ جبکہ ''متفرقات'' میں تحریک ہجرت ۱۹۱۹ء پر منظومات شامل ہیں۔ کتاب سے تاریخ ماقبل تقسیم ہند اور مسلمانوں کے مسائل و آلام اور حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ گویا مرتب نے تاریخ پاکستان کا ایک باب اس کتاب کی شکل میں محفوظ کر دیا ہے جو ارباب فکر و نظر کے لیے ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ ■

☆☆☆

Marfat.com

اخبار

Marfat.com

قارئین کرام کی توجہ کے لیے

راولپنڈی اور اسلام آباد، کے علاوہ تمام علاقوں کے قارئین کرام سے گزارش ہے کہ وہ مجلہ پیغام آشنا یا ہماری دوسری مطبوعات کے حصول کے لیے صرف اپنے قریب ترین خانہ فرہنگ سے رابطہ قائم کریں۔

ادارہ

Marfat.com

ثقافتی خبریں

ڈاکٹر عطا اللہ مہاجرانی کے لیے ستارہ پاکستان کا اعزاز

صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان محمد رفیق تارڑ نے اسلامی جمہوریہ ایران کے سابق وزیر ثقافت اور مرکز گفت و گوی تمدنہا کے موجودہ سربراہ ڈاکٹر عطا اللہ مہاجرانی کو ان کی پاکستان اور ایران کے ثقافتی روابط کی ترقی و وسعت کے سلسلے میں انجام دی گئی خدمات کے پیش نظر ''ستارہ پاکستان'' کا اعزاز عطا کیا۔ حکومت پاکستان کی طرف سے یہ اعزاز پیش کرنے کے لیے تہران میں پاکستانی سفیر جناب جاوید حسین کی رہائش گاہ پر ایک خصوصی تقریب منعقد ہوئی جس میں دونوں برادر ملکوں کی ممتاز شخصیات اور تہران میں مقیم پاکستانیوں کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔

دانش نامہ جہان اسلام

یہ آغاز اسلام سے لے کر عصر حاضر تک اسلامی شریعت، تاریخ اور تمدن کا انسائیکلو پیڈیا ہے جس کی تدوین انقلاب اسلامی کی کامرانی کے فوراً بعد شروع ہوئی۔ گذشتہ صدی میں اہل مغرب نے اسلامی تاریخ اور تہذیب و تمدن کے بارے میں کئی انسائیکلو پیڈیا تیار کیے مگر وہ تمام اہل غرب کے نظریات کے زیر اثر ہیں۔ ۱۹۸۳ء میں عالم اسلام کی عظیم اسلامی تمدنی میراث کو پیش کرنے اور مسلمان اقوام کے ثقافتی رشتوں کو مستحکم کرنے کے ب تہران میں بنیاد دائرۃ المعارف الاسلامی کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا جس نے مذکورہ کام کا بیڑہ اٹھایا۔ دنیائے اسلام میں انسائیکلو پیڈیا تیار کرنے کا فن دوسری ہجری سے شروع ہوا جو تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں اپنے عروج کو جا پہنچا۔ مسلمان دانشمندوں نے علمی ضروریات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے علوم و فنون کے ماہرین کے حالات زندگی اور نظریات سے متعلق مختلف فہرستیں مرتب کیں، جس کی ایک عمدہ مثال ابن الندیم (متوفی ۳۸۵ھ) کی الفہرست ہے۔ اسی طرح کی اور کتب جن میں علوم و فنون کی تعریف، درجہ بندی اور رائج اصطلاحات کی مختصر وضاحت موجود ہے ابونصر فارابی کی کتاب احصاء العلوم اور خوارزمی کی کتاب مفاتیح العلوم ہیں۔ دانشنامۂ جہان اسلام میں شامل مقالات کا ایک حصہ اسلام اور ایران کے فارسی ادب کے بارے میں ہے۔ ان کی تالیف میں ایرانی اور عالم اسلامی کے دیگر محققین بھرپور حصہ لے رہے ہیں۔ دوسری قسم کے مقالات، جن کے لیے مناسب لکھنے والے بہ آسانی فراہم نہ ہو سکے، دیگر زبانوں سے ترجمہ کر لیے گیے ہیں۔ اس میں شامل ہر مقالے کے آخر میں مصنف یا مصنفین کے نام موجود ہیں اور اگر مقالہ کسی دوسرے انسائیکلو پیڈیا سے ترجمہ شدہ ہو تو مصنف کے نام کے بعد ماخذ کا ذکر بھی کر دیا گیا ہے۔ مقالوں کے تراجم کے ساتھ ساتھ ضمیموں اور توضیحات کا اضافہ بھی کیا گیا ہے، کبھی حواشی میں اور کبھی ہلالین کے اندر۔ عام طور پر دائرۃ المعارف

Marfat.com

کا آغاز حرف ''آ'' یا ''با'' سے ہوتا ہے مگر مذکورہ دائرۃ المعارف کو حرف ''ب'' سے شروع کیا گیا ہے اور ''آ'' اور ''ا'' کو بعد کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس وقت ''پ'' ''ت'' ''ج'' اور ''چ'' کے حروف سے شروع ہونے والے مقالات ترتیب و تدوین کے مراحل میں ہیں۔ دانش نامہ میں تمام تاریخیں ہجری قمری تقویم کے مطابق ہیں البتہ بعض مقامات پر اہم واقعات کے ہمراہ معادل عیسوی تاریخیں بھی دے دی گئی ہیں۔ نیز ہر مقالہ کی تیاری کے دوران استعمال میں آنے والی کتابوں کے حوالہ جات کا اجمالی ذکر مقالے کے آخر میں موجود ہے۔ شیوہ نامہ دانشنامۂ جہان اسلام کے نام سے ایک الگ کتاب بھی تالیف کی گئی ہے جس میں مصنفین کی راہنمائی کے لیے دانشنامہ کے طرز تحریر، مقالات کی داخلی ترتیب، مآخذ، علامات، رسم الخط، ضبط اعلام، فصل اور وصل کی علامات، صوتیات کے اصول و ضوابط، اعراب گذاری وغیرہ سے متعلق تمام معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔

سال رواں کے عالمی انعام کے لیے منتخب شدہ کتابوں کا اعلان

ہر سال کی طرح اس سال بھی دفتر مجامع و فعالیتہای فرہنگی وزارت فرہنگ و ارشاد اسلامی نے عالمی انعام کے لیے مطالعات اسلامی اور مطالعات ایران کے عنوانات کے تحت بعض کتابوں کا انتخاب کیا۔ آیت اللہ شیخ محمد مہدی شمس الدین مرحوم کی ممتاز مفکر کی حیثیت سے تجلیل کی گئی کیونکہ انہوں نے عالم اسلام کی کئی عشروں تک خدمت کی تھی۔

مجامع کی شورائے مصنفین نے ڈاکٹر ولید الخالدی کی کتاب '' کی لاننسی '' قری فلسطین التی دمرتھا اسرائیل سنہ ۱۹۴۸ء و اسماء شھدائھا ''، کو جسے موسسہ الدراسات الفلسطینیہ بیروت نے شائع کیا اور جو صیہونیوں کے تاریخی جرائم سے پردہ اٹھاتی ہے، عالمی انعام دیا۔ کتاب میں شامل ۲۵۰ تصاویر اور ۴۳۰ نقشوں کی مدد سے فلسطینیوں پر اسرائیلی مظالم کو بے نقاب کیا گیا ہے۔

ایران شناسی کے حوالے سے پروفیسر ڈیوڈ اے کینگ نے قبلہ کا رخ اور فاصلہ معلوم کرنے سے متعلق مباحث پر ایک مفصل تحقیقی کتاب *World Maps for Finding the Direction and Distance to Mecca: Innovation and Tradition in Islamic Science* لکھی ہے۔ اس کتاب میں قبلہ یابی کے بارے میں جو مرحلہ وار ترقی ہوئی، خصوصاً دور صفوی کے ایران میں، اس پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جیوری نے بوسٹن میں شائع ہونے والی اس کتاب کو بھی سال رواں کا عالمی انعام دیا۔

خانہ فرہنگ پشاور میں یوم اقبال کی مناسبت سے مجلس مذاکرہ کا انعقاد

۹ نومبر ۲۰۰۰ کو یوم اقبال کی مناسبت سے خانہ فرہنگ ایران پشاور میں ایک مذاکرہ منعقد

Marfat.com

ہوا جس میں چیف سیکرٹری صوبہ سرحد جناب عبداللہ نے ''اقبال اور عصر حاضر کے تقاضے'' کے عنوان سے تقریر کی۔ جناب عبداللہ نے اپنے خطاب میں علامہ اقبال کے کلام میں موجود بلند افکار کے رموز و اسرار پر روشنی ڈالی۔ انہوں نے کہا اقبال تہذیبی اعتبار سے مسلمانوں کو ایک ناقابل تقسیم وحدت سمجھتے تھے۔ اسی لیے وہ وطنیت اور نسل پرستی کو اتحاد کا بڑا دشمن اور انسانیت کے لیے تباہ کن قرار دیتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ اقبال کے نزدیک مسلمانوں کی زبوں حالی کے اسباب میں قیادت کا فقدان، اور ان کی جمودی کیفیت کا ہاتھ ہے۔ جناب عبداللہ نے فکر اقبال کی ترویج کے لیے انفرادی اور معاشرتی سطح پر کوششوں کی ضرورت پر زور دیا۔ مہمان خصوصی کی تقریر سے پہلے مدیر خانہ فرہنگ جناب آقای سہراب نے بھی خطاب کیا۔

محفل میں موجود دانشوروں، شعراء اور ادباء نے چیف سیکرٹری کی تقریر کے بعد موضوع سے متعلق سوالات کے جوابات حاصل کیے۔ جن خواتین و حضرات نے سوالات کیے ان میں معروف شاعرہ و ادیبہ قدسیہ قدسی، پروفیسر ڈاکٹر ظہور احمد خان، جناب نسیم خٹک صاحب، پروفیسر سہیل اور پروفیسر فتح الرحمن وغیرہ شامل تھے۔

اس مذاکرے کو پریس نے بھرپور کوریج دی اور علمی و ادبی حلقوں نے اسے خوب سراہا۔

تمدنوں کی گفتگو کے سال کی مناسبت سے خانہ فرہنگ پشاور میں تقریب

۲۰۰۱ کو اقوام متحدہ کی طرف سے صدر اسلامی جمہوریہ ایران آقای خاتمی کی تجویز پر تمدنوں کی گفتگو کا سال قرار دیے جانے کے سلسلے میں خانہ فرہنگ پشاور نے یکم جنوری ۲۰۰۱ کو ایک خصوصی تقریب کا انعقاد کیا جس میں معروف اساتذہ کرام، تاریخ کے طالب علموں، صحافیوں، پولیٹیکل سائنس، بین الاقوامی تعلقات اور فارسی زبان کے ماہرین نے شرکت کی۔ پروگرام میں تقریر کرتے ہوئے مدیر خانہ فرہنگ آقائے سہراب نے اقوام متحدہ میں آقائے محمد خاتمی کی تجویز کو ایک عالمی نظریہ کی ابتدا قرار دیتے ہوئے کہا یہ تجویز اس حد تک انسانی اور اخلاقی معیاروں پر استوار تھی کہ اس کے ساتھ کسی قسم کی مخالفت کی گنجائش نہ تھی۔ انہوں نے اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کے نمائندے دومنیکو پیکو کی تحریک پر دنیا کی ۱۹ دانشمند شخصیات تمدنوں کی گفتگو کے موضوع پر ایک کتاب تالیف کر رہی ہیں جس میں تمدنوں کی گفتگو کے ارتقاء کے ایک بین الاقوامی نظام پر منتج ہونے کی بحث ہے۔

جناب ڈاکٹر اشرف عدیل نے اپنی تقریر میں کہا تمدنوں کی گفتگو کے موضوع کی جڑیں تمدن اور اخلاق کے بنیادی تصور میں موجود ہیں اور ہمیں اس سلسلے میں پیغمبر اسلام (ص) کی احادیث کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ انہوں نے کہا تمدن کے معنی دوسروں کے حقوق کا مکمل احترام ہے۔ انہوں نے موجودہ دنیا کے پانچ بڑے تمدنوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا یہ تمام تمدن انسانی

Marfat.com

احترام کے قائل ہیں، لہذا مغربی تمدن سے مربوط بڑی طاقتوں کو اپنی استعماری پالیسیاں دوسروں پر مسلط کرنے کا حق حاصل نہیں اور یہ کہ انسانیت کو بالآخر بقائے باہمی کے اصول اپنانے ہونگے۔

محترم جناب عبداللٰھی قونصلر اسلامی جمہوریہ ایران نے دور حاضر میں گفتگو کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ثقافتی یلغار کی طرف اشارہ کیا اور بتایا کہ یہ ثقافتی یورش روسی نظام کے انہدام کے بعد طاقت کے خلا کے وجود میں آنے سے شروع ہوئی۔ جناب عبداللٰھی نے اپنی تقریر میں امریکی دانشور سیموئیل ہینٹنگٹن کے تمدنوں کے ٹکراؤ اور جناب آقائے محمد خاتمی کے تمدنوں کی گفتگو کے نظریات کا تقابلی جائزہ پیش کرتے ہوئے خاتمی کے نظریے کو قرآن کے اس تعارفی فلسفے کا جلوہ قرار دیا جس میں بنی نوع انسان کو ایک مرد اور عورت کی اولاد قرار دیتے ہوئے شعوب و قبائل کو فقط تعارف کا وسیلہ اور تقویٰ کو قرب خداوندی کا واحد ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔

انہوں نے نے امید ظاہر کی کہ گفتگو کے نتیجے میں یہ دنیا امن و آشتی، عدل و انصاف اور انسانی وقار و احترام کا گہوارہ بن جائے گی۔ تقریب کے آخر میں سوال و جواب کا سیشن ہوا جس میں جناب ڈاکٹر اشرف عدیل نے حاضرین کے مختلف سوالوں کے جواب دیئے۔

پروفیسر مقصود جعفری کا بحیثیت علمی شخصیت کے انتخاب

مدیر داخلی مجلہ پیغام آشنا پروفیسر مقصود جعفری کو ان کی تخلیقی و تحقیقی تصانیف اور علمی و ادبی خدمات کے پیش نظر انٹرنیشنل بایوگرافیکل سنٹر کیمبرج انگلینڈ نے اعزازی سند دیتے ہوئے اکیسویں صدی کی ایک ممتاز قلمی شخصیت قرار دیا ہے۔ سنٹر کے ڈائریکٹر جنرل نکولس سلا نے ایک کمیٹی کے ذریعے کئی ہزار دانشوروں کے کوائف کی تحقیق کرنے کے بعد اکیسویں صدی بین الاقوامی شخصیات کی جو ڈکشنری مرتب کی ہے اس میں پروفیسر مقصود جعفری کا نام بھی شامل کیا گیا ہے۔

اس وقت تک اردو، فارسی اور انگریزی میں شاعری، فلسفہ اور سیاسیات پر پروفیسر مقصود جعفری کی پچیس کتابیں منصہ شہود پر آ چکی ہیں۔

یہاں اس بات کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ یہی اعزاز مجلہ پیغام آشنا کے سردبیر جناب ڈاکٹر محمد سلیم اختر کو بھی ۱۹۹۸ء میں مل چکا ہے۔

خانہ فرہنگ کوئٹہ کی عشرہ فجر تقریبات

خانہ فرہنگ کوئٹہ نے انقلاب اسلامی کی بائیسویں سالگرہ کے موقع پر رنگا رنگ تقریبات منعقد کیں جن میں ایرانی نیز کوئٹہ کے مقامی مصوروں کے فن پاروں اور مختلف موضوعات پر کتابوں کی نمائش شامل تھی۔ اس موقع پر جناب عیسیٰ کریمی ڈائریکٹر خانہ فرہنگ نے اپنے خطاب میں کہا ہم مشترکہ ثقافتی اور دینی ورثوں کی حفاظت کو اپنا فرض سمجھتے ہوئے تمام ثقافتی اداروں سے ہر نوع تعاون کے

Marfat.com

لیے تیار ہیں۔ اسی طرح اس موقع پر انقلابی موضوعات پر مشتمل ایک رسالہ شائع کیا گیا جو خوبصورت تصاویر سے مزین ہے۔

ڈاکٹر نجم الرشید کی شعبہ فارسی، پنجاب یونیورسٹی میں تقرری

ڈاکٹر نجم الرشید ۲۳ رفروری ۲۰۰۱ء سے پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں لیکچرر مقرر ہو گئے ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی سے فارسی زبان میں ایم اے کرنے کے بعد انہوں نے کچھ عرصہ تک کلچرل قونصلیٹ اسلامی جمہوریہ ایران - اسلام آباد میں مجلّہ دانش کے سب ایڈیٹر کے طور پر فرائض انجام دیے۔ بعد ازاں وہ بلوچستان یونیورسٹی میں لیکچرر کے طور پر ملازم ہو گئے اور پھر وہیں سے پی ایچ ڈی کرنے کے لیے ایران چلے گئے۔ تہران میں قیام کے دوران انہوں نے تعلیم کے ساتھ ساتھ مختلف علمی مراکز مثلاً فرہنگستان زبان وادب فارسی اور دائرۃ المعارف بزرگ اسلامی وغیرہ میں کام کیا۔ انہوں نے بارھویں صدی ہجری کے دوران برصغیر میں فارسی شعر وسخن پر تنقید کے موضوع پر ڈاکٹر تقی پور نامداریان، ڈاکٹر شفیعی کدکنی، اور ڈاکٹر محسن ابوالقاسمی کی نگرانی میں اپنا تحقیقی مقالہ لکھا جس پر انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی۔ ڈاکٹر نجم الرشید کے فارسی زبان وادب کے حوالے سے کئی مقالے دانش (اسلام آباد) اور نامہ پارسی (تہران) میں شائع ہو چکے ہیں۔

پروفیسر مقصود جعفری کے فارسی شعری مجموعے کی تقریب رونمائی

مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان اسلام آباد نے ۱۵ اپریل ۲۰۰۱ء کو معروف دانشور شاعر اور ادیب پروفیسر مقصود جعفری کے شعری مجموعے جام وفا کی تقریب رونمائی کا اہتمام کیا۔ تقریب کی صدارت وفاقی وزیر کیبنٹ ڈویژن جناب محمود علی نے کی جبکہ سفارتخانہ اسلامی جمہوریہ ایران کے آقائے شریفی مہمان خصوصی تھے۔ جناب محمود علی نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا فارسی دنیا کی بہترین زبان ہے جو بہت سے ممالک میں ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ تک سرکاری طور پر رائج رہی۔ مختلف مقررین جن میں محترمہ عائشہ مسعود صاحبہ، جناب مرتضی موسوی، پروفیسر جان عالم، ڈاکٹر عالیہ امام، ابن سینا یونیورسٹی کے وائس چانسلر آقائے داؤد راوش اور مرکز تحقیقات فارسی کے ڈائریکٹر جناب ڈاکٹر سید بزرگ بیگدلی شامل تھے، نے اپنی تقریروں میں فارسی زبان کی ادبی، ثقافتی اور تاریخی اہمیت اجاگر کی اور اسے ایران و پاکستان کے برادر ممالک کو باہم نزدیک کرنے کا بنیادی ذریعہ قرار دیا۔

ہفتہ وحدت اور امام خمینی کی بارھویں برسی

خانہ فرہنگ کوئٹہ نے اس موقع پر مشترکہ تقریب میں اتحاد بین المسلمین کے سلسلے میں کوئٹہ

Marfat.com

کے ۱۷ بڑے ہائی سکولوں کے درمیان تقریری مقابلہ منعقد کرایا جس میں مقررین نے اتحاد مسلمین پر مفید تقاریر کیں۔ اسی سلسلے میں ۳ جون ۲۰۰۱ء کو ایک سیمینار بھی منعقد کیا گیا۔ سیمینار کے ساتھ ساتھ ایک تصویری نمائش جس میں ٹکٹوں، کمپیوٹر اور امام خمینی سے متعلق CDs اور کتابوں کی نمائش شامل تھی منعقد کی گئی۔

امام خمینی کی برسی کی مناسبت سے مشاعرہ

۳ جون ۲۰۰۱ء کو رایزنی فرہنگی اسلامی جمہوریہ ایران کی طرف سے اسلام آباد میں امام خمینی کی بارھویں برسی کے موقع پر معروف شاعر احمد فراز کی صدارت میں ایک محفل مشاعرہ منعقد ہوئی

امام خمینی کی بارھویں برسی محفل مشاعرہ:
کلچرل قونصلر ڈاکٹر رضا مصطفوی خطاب کر رہے ہیں

امام خمینی مشاعرہ میں حاضرین محفل

جس میں راولپنڈی اسلام آباد کے معروف شعرا نے امام خمینی کی شخصیت اور افکار کو اجاگر کرنے کے سلسلے میں اپنے کلام پیش کیے۔ جن شعرا نے اپنے کلام پیش کیے ان میں احمد فراز، مقصود جعفری، فائزہ زہرا مرزا، غضنفر ہاشمی، ڈاکٹر محمد سرفراز، طارق نعیم، خورشید خاور، ڈاکٹر محمد حسین تسبیحی، پروفیسر جلیل عالی، رشید نثار، نیسان اکبر آبادی، سلمان رضوی، ناصر زیدی، نصرت زیدی، سرفراز شاہد، جاوید اقبال قزلباش شامل ہیں۔ اس موقع پر کلچرل قونصلر جناب ڈاکٹر رضا مصطفوی نے امام خمینی کے اشعار میں معنوی
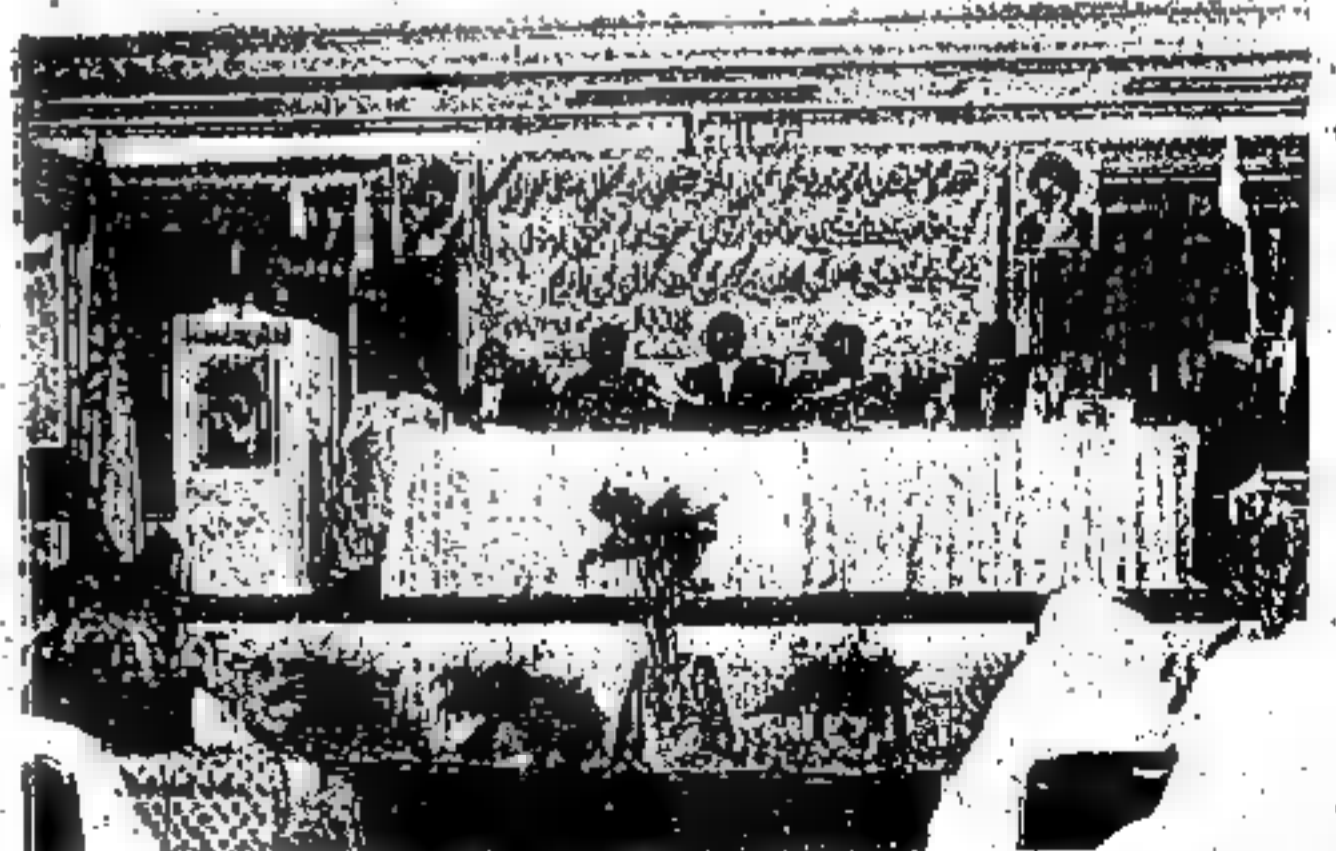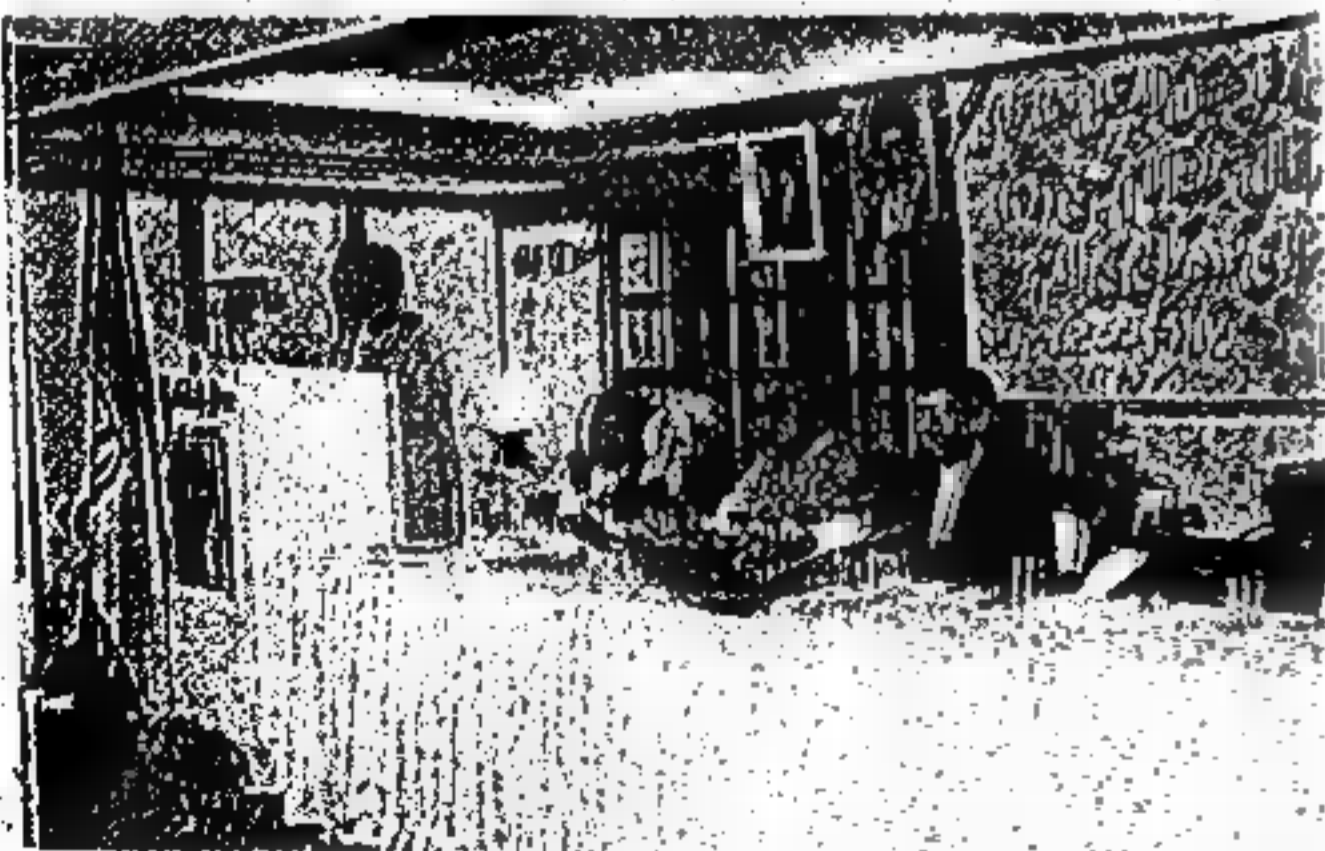
محفل مشاعرہ: جناب ڈاکٹر رضا مصطفوی، جناب ڈاکٹر غضنفر مہدی، جناب آقائی علائی، جناب احمد فراز، جناب مرتضیٰ پویا

امام خمینی مشاعرہ میں جناب احمد فراز صاحب سامعین سے مخاطب ہیں

Marfat.com

پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے ان کی حق بینی کی قوت اور راسخ ایمان و اعتقاد کو خراج عقیدت پیش کیا۔ جناب ڈاکٹر غضنفر مہدی نے امام کی شخصیت کو سارے عالم اسلام کا رہبر قرار دیا۔ جناب آقائے مرتضیٰ پویا نے انقلاب اسلامی کو مستضعفین کا مددگار قرار دیا۔ جناب احمد فراز نے کہا امام نہ صرف رہبر بلکہ عظیم شاعر بھی تھے۔

خانہ فرہنگ کراچی کی طرف سے امام خمینیؒ اور وحدت اسلامی سیمینار

خانہ فرہنگ اسلامی جمہوریہ ایران کراچی نے اتوار ۱۰ جون ۲۰۰۱ (۲۰ خرداد ماہ ۱۳۸۰ ھ ش) کو امام خمینیؒ کی بارھویں برسی کی مناسبت سے کراچی میں ''عصر حاضر میں امام خمینیؒ اور وحدت اسلامی'' کے عنوان سے ایک سیمینار منعقد کیا۔ اس سیمینار میں پاکستان کی علمی و ثقافتی شخصیات نے ''امام خمینی اور وحدت'' کے موضوع پر تقریریں کیں اور مقالے پیش کیے۔ کلچرل قونصلر اسلامی جمہوریہ ایران جناب ڈاکٹر رضا مصطفوی نے ''اہل توحید میں اتحاد'' (امام خمینی کے نکتہ نظر سے) کے موضوع پر تقریر فرمائی جسے اہل علم نے از حد سراہا۔

ایران میں صدارتی انتخابات:

ایرانی صدر آقائے محمد خاتمی نے صدارتی انتخابات میں کل ووٹوں کا ۷۷ % حاصل کر کے شاندار کامیابی حاصل کر لی ہے۔ وزارت داخلہ ایران نے ۹ جون کو جو اعداد و شمار پیش کیے ان کے مطابق ۸ جون کو ہونے والے صدارتی انتخابات میں پڑنے والے ۲۸٫۲ میلین ووٹوں میں سے انہوں نے ۲۱٫۷ میلین ووٹ حاصل کیے۔

چنانچہ اس مرتبہ انہوں نے ۱۹۹۷ء کے انتخابات سے بھی بڑی اکثریت حاصل کی ہے جبکہ گزشتہ مرتبہ کے انتخابات میں انہوں نے کل ۶۹.۱ % ووٹ حاصل کیے تھے۔

موجودہ اعداد و شمار کے مطابق موجودہ انتخاب میں ۴۲ میلین ووٹروں میں سے ۶۷ % نے ووٹ ڈالا جبکہ ۱۹۹۷ء میں ۸۳ % نے ووٹروں نے ووٹنگ میں حصہ لیا تھا۔

جناب ڈاکٹر رضا مصطفوی کی جناب احمد فراز سے ملاقات

کلچرل قونصلر سفارت اسلامی جمہوریہ ایران جناب ڈاکٹر رضا مصطفوی نے ۱۷ جون ۲۰۰۰ء کو پاکستان نیشنل بک فاؤنڈیشن کا دورہ کیا اور ادارے کے سربراہ جناب احمد فراز سے ملاقات کی۔ دونوں اداروں کے سربراہوں نے پاکستان اور ایران کی مشترکہ ثقافت اور ادبیات سے متعلق باہمی دلچسپی کے امور پر تبادلہ خیال کیا۔ جناب احمد فراز نے پاکستان میں فارسی زبان و ادبیات کی حفظ و بقا کے سلسلے میں خانہ ہائے فرہنگ کی کوششوں کی تعریف کی اور کہا اگر ان اداروں کی کوششیں نہ ہوتیں تو فارسی زبان جو پاکستان اور ایران کی مشترکہ میراث ہے ختم ہو چکی ہوتی۔ اس موقع پر جناب

Marfat.com

جناب ڈاکٹر رضا مصطفوی، جناب احمد فراز سے ملاقات کر رہے ہیں
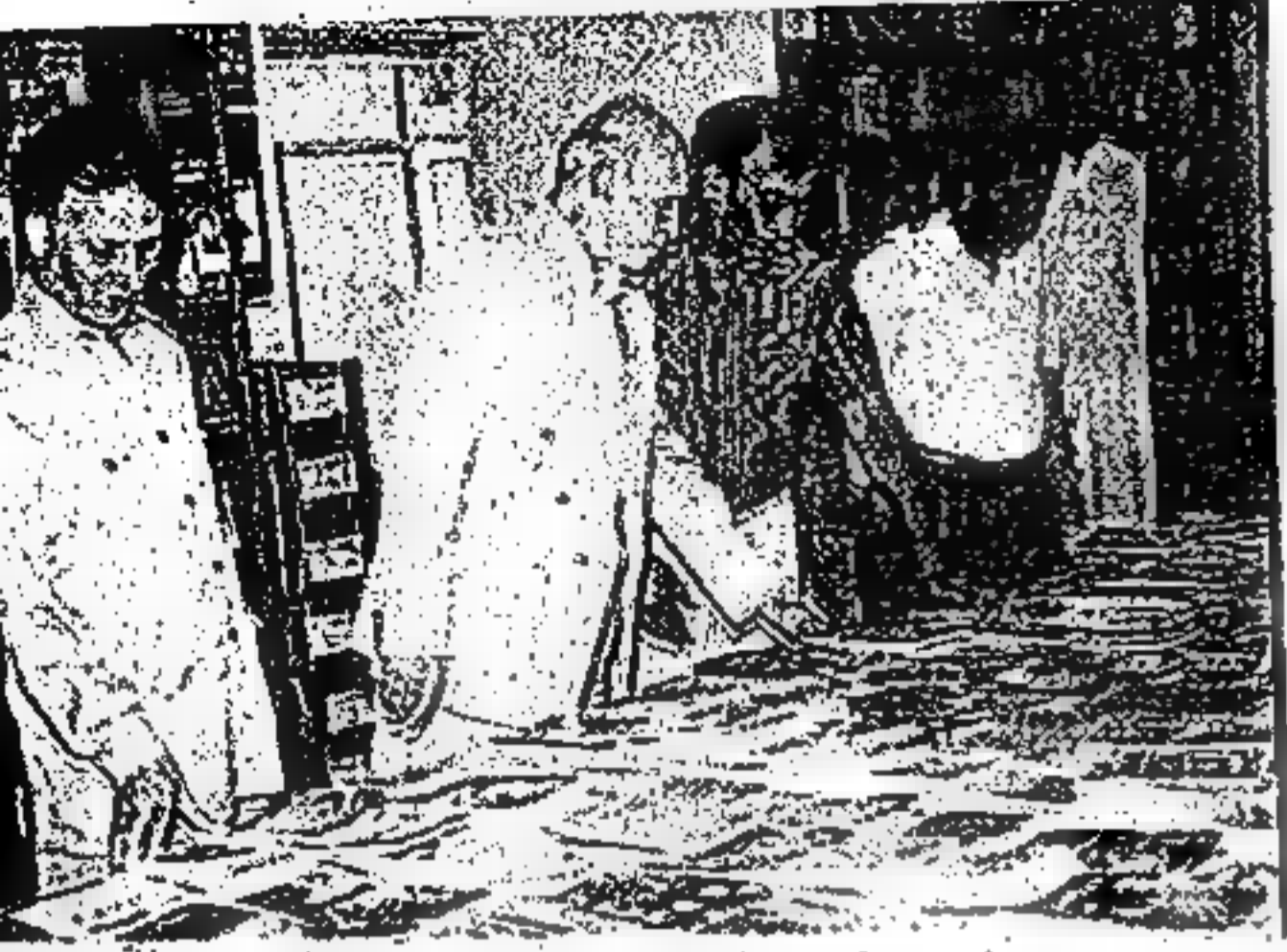
جناب احمد فراز، ڈاکٹر رضا مصطفوی کو نیشنل بک فاونڈیشن کی مطبوعہ کتابیں دکھا رہے ہیں۔

احمد فراز نے اپنے ادارہ کی گذشتہ ۵ سالہ خدمات پر، جس میں ۳۵۰۰ کتابوں کی طباعت و اشاعت شامل ہے، روشنی ڈالی اور جناب آقائے مصطفوی کو اپنے ادارے کے مختلف شعبوں کی کارکردگی سے آگاہ کیا، نیز انہیں اپنے ادارے کی بعض مطبوعہ کتابیں دکھائیں۔

وادی سندھ کا تمدن کے موضوع پر سہ روزہ بین الاقوامی سیمینار

حکومت پاکستان نے یونیسکو کے تعاون سے ''وادی سندھ کا تمدن'' کے موضوع پر اسلام آباد میں ایک سہ روزہ بین الاقوامی سیمینار کا اہتمام کیا جو ۶ سے ۱۸ اپریل ۲۰۰۱ء تک جاری رہا۔ اس سیمینار میں جاپان، ایران، ازبکستان، انڈیا، ملائیشیا، فرانس اور امریکہ سے ۸۰ ماہرین اور دانشوروں نے شرکت کی۔ سیمینار میں مقالات پڑھنے کے لیے دو موضوعات ۱۔ وادی سندھ تمدنوں کا سنگھم ۲۔ وادی سندھ تاریخی نکتہ نظر سے، منتخب کیے گئے تھے۔ یونیورسٹی پروفیسر اور کلچرل قونصلر اسلامی جمہوریہ

جناب ڈاکٹر رضا مصطفوی سیمینار ''وادی سندھ کا تمدن'' میں خطاب کر رہے ہیں

Marfat.com

ایران اسلام آباد جناب ڈاکٹر رضا مصطفوی نے اس سیمینار میں ایران کی نمائندگی کرتے ہوئے "تمدن سندھ میں ایران کا کردار" کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ایسے مفید اور قابل قدر علمی سیمینار کے انعقاد پر جو صدر ایران جناب آقائے محمد خاتمی کی طرف سے ۲۰۰۱ء کو تمدنوں کی گفتگو کا سال قرار دیے جانے کی تجویز اور اقوام متحدہ کے اسے منظور کر لینے کے سلسلے کی کڑی ہے، حکومت پاکستان اور یونیسکو کا شکریہ ادا۔ انہوں نے اپنے مقالے میں وادی سندھ کے تمدن پر ایرانی تمدن کے بے شمار آثرات کے چند گوشوں کی طرف، جن میں علم و ادب، شعر و موسیقی، عرفاء و علماء کا کردار، آثار قدیمہ، فنون لطیفہ اور فارسی مخطوطات شامل ہیں، اشارہ کیا اور شاہنامہ فردوسی جیسے معتبر منابع سے حوالے دیے۔ یونیسکو کے نمائندہ جناب احمد آدم اور سیمینار کے مندوبین نے ان کے مقالے کو از حد سراہا اور انہیں سیمینار کی شیلڈ پیش کی گئی۔ مقالہ مذکور کا ترجمہ اسلام آباد کے انگریزی رسالہ The Concept کے شمارہ ۵ مئی ۲۰۰۱ء میں شائع ہو چکا ہے۔

جناب سید محمد خاتمی صدر اسلامی جمہوریہ ایران کی ۱۱۹ اکتوبر ۱۹۹۸ء کو یونیسکو کے پیرس اجلاس میں خطاب سے اقتباس:

ثقافتوں اور تمدنوں کی گفتگو میں بات کرنے کے علاوہ سننا بھی لازمی ہے۔ سماعت کرنا ایسی فضیلت ہے کہ جسے حاصل کرنا چاہیے اور جو آسانی سے حاصل نہیں ہوتی کیونکہ اسے حاصل کرنے کے لیے انسان کو اخلاقی تربیت، نفسانی تطہیر اور عقل کی نشوونما کے سلسلے میں اقدام کرنا ہوتا ہے۔ سننے اور سکوت اختیار کرنے میں فرق ہے۔ سننا صرف ایک انفعالی اور اثر پذیرانہ ہی نہیں بلکہ ایک ایسا کام ہے جو اس بات کا موجب ہے کہ سامع اپنے وجود کو بات کرنے والے کی طرف سے خلق یا انکشاف کی گئی دنیا کے سامنے کھول کر رکھ دے ہر گفتگو حقیقی سماعت کے بغیر ناکام ہو جاتی ہے۔

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز میں تقریری مقابلہ

۲۸ فروری ۲۰۰۱ء (۱۰ اسفند ۱۳۷۹) کو نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد میں رایزنی فرہنگی سفارت اسلامی جمہوریہ ایران اور مرکز تحقیقات فارسی ایران پاکستان کے تعاون سے پاکستانی یونیورسٹیوں کے فارسی زبان کے ایم فل کے طلبا کے مابین تقریری مقابلہ منعقد ہوا۔ اس موقع پر سفیر ج۔ا۔ ایران جناب سراج الدین موسوی نے اپنے خطاب میں فرمایا: اس قسم کے تقریری مقابلے علمی اور ثقافتی نکتہ نظر سے دونوں ملکوں کے روابط کے استحکام کا باعث بنتے ہیں۔ تقریب میں کراچی، لاہور،

Marfat.com

کوئٹہ، پشاور، ملتان، بہاول پور اور اسلام آباد سے یونیورسٹی اساتذہ اور سربراہوں نیز فارسی کلاسوں کے طالب علموں سمیت تقریباً ۱۲۰۰ افراد نے شرکت کی۔ آخر میں مقابلے میں اول دوم سوم آنے والے طلبا کو انعامات دیے گئے۔

☆ ☆ ☆

Marfat.com

قارئین کے خطوط

Marfat.com

پیغام آشنا کے نام

مجلہ پیغام آشنا اپنے ثقافتی علمی اور ادبی سفر کو طے کرتے ہوئے تمدنوں کی گفتگو کے سال میں وارد ہو چکا ہے۔ ہر دور کے اپنے کچھ تقاضے ہوتے ہیں اور غربت، افلاس، جنگ اور وبا کی ماری ہوئی آج کی پر آشوب دنیا میں تمدنوں کی گفتگو کا موضوع ایک امید کی کرن بن کر ابھرا ہے۔ ہم نے انسانیت کی اسی امید کے ناتے سے اس شمارے کو تمدنوں کی گفتگو کے موضوع سے مخصوص کیا ہے جس کے بارے میں ہمیں آپ کی آراء کا انتظار رہے گا۔ دراین اثنا گذشتہ شماروں کے حوالے سے کرم فرماؤں نے جو نوازش نامے ارسال کیے ہیں، ان میں سے بعض اقتباسات پیش نظر ہیں۔

ادارہ

افتخار عارف،

چیئرمین اکادمی ادبیات پاکستان۔ اسلام آباد

آپ کا ارسال کردہ شمارہ پیغام آشنا (دسمبر ۲۰۰۰ء) موصول ہوا۔ عنایت کہ آپ یاد رکھتے ہیں۔ کرم گستری کے لیے شکرگزار ہوں۔ انشاء اللہ خود بھی استفادہ کروں گا اور اکادمی ادبیات پاکستان کے کتب خانے کے توسط سے حلقے کے دیگر احباب بھی مستفید ہوں گے۔ اس تعاون کو جاری رکھیے۔

❀❀❀

پروفیسر ڈاکٹر گل حسن لغاری

پیغام آشنا کا تیسرا شمارہ موصول ہوا۔ واقعتاً یہ مجلہ معلومات میں اضافے اور پاکستان و ایران کے مابین مضبوط ادبی و ثقافتی رشتوں کی نشاندہی کا ذریعہ ہے۔ ترتیب و تدوین میں ایرانی انداز کی جھلک نمایاں ہے۔ اسلامی ثقافت، فارسی ادب اور تصوف و عرفان کی چاشنی بھی ہویدا ہے۔ بلاشبہ پیغام آشنا پیغام آشنا ہے۔ اس کی ترتیب و تدوین میں حصہ لینے والی پوری ٹیم مبارک باد کی مستحق ہے۔

❀❀❀

محمد منشا تابش قصوری

پیغام آشنا کا تیسرا شمارہ بھی لائق تحسین اور قابل مطالعہ ہے۔ نہایت مفید مقالات سے استفادہ کا موقع ملا۔ خدا کرے کہ مجلہ اسی ثابت قدمی سے جاری رہے۔ ادارے کے تمام افراد کو مجلے کی کامیاب اشاعت پر ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں۔

❀❀❀

حکیم محمد افتخار حسین اظہر چشتی، خانقاہ عالیہ چشتیہ

ڈیرہ نواب صاحب، ضلع بہاولپور

پیغام آشنا کی صورت میں اہل علم و دانش کو معلومات کا نیا سرچشمہ ملا ہے۔ ماشاء اللہ یہ مجلہ ظاہری و باطنی خوبیوں سے آراستہ ہے۔ اس کی وساطت سے دونوں برادر اسلامی ممالک ایران و پاکستان کے علمی، ادبی اور ثقافتی روابط کو فروغ ملے گا۔

❀❀❀

Marfat.com

محمد صادق قصوری، ناظم اعلیٰ مرکزی مجلس
امیر ملت، برج کلاں، ضلع قصور

پیغام آشنا کے تیسرے شمارے کے سرورق پر اپنے محبوب شاعر حافظ شیرازی کی مرقد کی تصویر دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ مضامین کے اعتبار سے گذشتہ دونوں شماروں سے زیادہ پرشکوہ ہے۔ صوری و معنوی لحاظ سے بھی متاثر کن ہے۔ جملہ مضامین ندرت و تنوع کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہیں۔ ہو سکے تو بزرگ فارسی شعراء کے بارے میں خصوصی نمبر شائع کریں۔ خدا آپ کے زور قلم میں اضافہ فرمائے۔

❀❀❀

اکرم شاہد، گلبرگ ٹاؤن چشتیاں

مجلّہ بہت معیاری، معلوماتی اور مفید ہے۔ اس سے نہ صرف برادر اسلامی ملک ایران کے ساتھ تعلقات مضبوط ہوں گے بلکہ مفکر اسلام شاعر مشرق حضرت علامہ محمد اقبال کے افکار کی بھی ترویج ہوتی رہے گی۔

❀❀❀

رابعہ طارق، ملتان روڈ، لاہور

پیغام آشنا نے خوش نما سرورق، معیاری، دلنشین اور مختلف النوع تخلیقات کے ساتھ اپنے پیغام سے آشنا کرنے میں واقعتاً بڑے سلیقے اور جانفشانی کا ثبوت دیا ہے۔ میدان ادب کی یہ نئی مگر عمدہ کاوش بجا طور پر لائق تحسین ہے۔

❀❀❀

محمد اسلم ضیاء، ایسوسی ایٹ پروفیسر، گورنمنٹ کالج، جھنگ

موضوعات کا تنوع، نقش ہائے رنگ رنگ، انتخاب مضامین میں ایک معیار، ترتیب میں خوش سلیقگی، طباعت و اشاعت میں نفاست و لطافت، پاک ایران ثقافت کا آئینہ دار، فارسی کے ساتھ اردو کی حوصلہ افزائی کرنے والا پیغام آشنا بات دل سے نکلے اور دل میں اترے کس خوبی کا ذکر کیا جائے:

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

❀❀❀

ڈاکٹر سیدہ نگہت سجاد زیدی، لطیف آباد، حیدر آباد (سندھ)

علم و ثقافت اور دوستی کے اس انمول خزینے کے اجراء پر مبارکباد قبول فرمائیں۔ کتنی خوبصورتی سے علم و ادب اور ثقافت و دوستی کو ایک لڑی میں پرویا گیا ہے۔ اساتذہ وقت کی تحقیقی اور مستند تحریروں سے ذہن و دل کو نئی تازگی اور شگفتگی حاصل ہوئی ہے جس کے لیے واقعی شکر گزار ہوں۔

❀❀❀

نذیر احمد شاکر، گڑھی یاسین، ضلع شکار پور، سندھ

پیغام آشنا جہاں ایران، ہندوستان، افغانستان اور دوسرے ممالک میں فارسی زبان، علم و ادب، تاریخ، ثقافت اور شاعری پر تحقیقی مواد شائع کر کے معلومات میں اضافے کا سبب ہے وہاں ایران و پاکستان کے قدیم خونی، لسانی و ثقافتی روابط کے قالب میں نئی روح پھونک کر انہیں مستحکم تر کرنے میں اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔

❀❀❀

سید ولی خیال مہمند، ریذیڈنٹ ڈائریکٹر اکادمی ادبیات پاکستان، پشاور

اس جریدے کا اجراء کر کے ایرانی ثقافتی قونصلیٹ نے وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کر دیا ہے جو نہایت خوش آئند اقدام ہے۔ اس سے نہ صرف ایرانی اور پاکستانی ادیبوں کو ایک دوسرے کے تجربات سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملے گا بلکہ عالمی ادب کے بارے میں بھی بہت کچھ جاننے کا موقع ملے گا۔ نیز اس سے دونوں برادر ملکوں کے عوام کو ایک دوسرے کے قریب لانے اور صدیوں سے قائم مذہبی، لسانی، تہذیبی اور ثقافتی رشتوں کو مزید مستحکم کرنے میں بھی مدد ملے گی۔ علاوہ ازیں اس سے اردو اور فارسی ادب کے فنکاروں کو اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھانے کے مواقع میسر آتے

Marfat.com

کے ساتھ ساتھ نوجوان نسل کو اپنے اسلاف کے کارناموں سے بھی روشناس کرایا جا سکے گا۔ اس رسالے میں شامل مختلف علمی و ادبی موضوعات کے لیے الگ الگ گوشے مخصوص کر کے طالبان علم و فن کے لیے آسانی اور دلچسپی کا سامان پیدا کیا گیا ہے، جو قابل تعریف ہے۔

❀❀❀

سیدہ ساجدہ باقر، کھروٹہ سیداں، سیالکوٹ

پیغام آشنا ہر لحاظ سے پاکستان ایران دوستی کا پیامبر ہے۔ نہایت خوبصورت، دیدہ زیب، عمیق تحقیقی و تخلیقی مواد کا حامل اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایران و پاکستان کی مشترکہ اقدار کا ترجمان ہے۔ ان تمام خوبیوں کا یکجا ہونا دشوار نظر آتا تھا مگر پیغام آشنا اپنی اس کوشش میں کامیاب نظر آتا ہے۔ خدا کرے کہ یہ ہمیشہ جاری رہے۔

❀❀❀

محمد رضا اخوندزادہ، برق چھن چلو، ضلع گانچھے، بلتستان

پیغام آشنا کا تحقیقی ذوق اور تخلیقی انداز قابل تعریف ہے۔ مجلہ واقعتاً مدیر مسئول کی ثقافتی سرگرمیوں اور علمی مشاغل کا آئینہ دار ہے۔ خدا ان کی توفیقات خیر میں اضافہ فرمائے۔

❀❀❀

مولانا احمد حسن نوری، گوجرانوالہ

پیغام آشنا کے تینوں شمارے سامنے ہیں۔ انہیں پاک ایران دوستی کا عظیم شاہکار کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ تمام مضامین دل موہ لینے والے ہیں۔ خصوصاً ''اسلام کا تصور محنت'' اور ''کچھ ایدز کی باتیں'' بہت دلچسپ ہیں۔ بلاشبہ تمام ایرانی مجلات سے زیادہ خوبصورت اور مواد کے لحاظ سے جدید انتخاب ہے۔ خداوند قدوس اسے چشم بد سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

❀❀❀

محمد حسن حسرت بلتستانی، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ریجنل سنٹر، گلگت

پیغام آشنا کا دوسرا اور تیسرا شمارہ موصول ہوا۔ پڑھ کر بڑا لطف آیا۔ حقیقتاً یہ ادبی و علمی کاوش لائق تحسین و تبریک اور متلاشیان علم و ادب کے ذوق کے لیے باعث تسکین ہے۔

❀❀❀

عبدالرحیم روزی، سیکرٹری مکتبہ الشباب الاسلامی۔ بلتستان۔

مجلہ پیغام آشنا موصول ہوا۔ اردو ادب اور اقبالیات کے حوالے سے آپ حضرات ناقابل فراموش خدمات انجام دے رہے ہیں۔ دعا گو ہوں کہ آپ کے زندہ جاوید اعمال مزید دو آتشہ ہو کر مقبول بارگاہ ایزدی ہو جائیں۔ میری طرف سے تمام قلمکاروں اور انتظامیہ کو مبارکباد۔

❀❀❀

سید حیدر عباس، ایڈیٹر خبر و نظر، سیالکوٹ

پیغام آشنا کا شمارہ ۳-ملا۔ پاکستان اور ایران کی صدیوں پرانی یکجہتی دوستی اور اخوت کے ہرام کو نئے ولولہ اور نئی جہت دینے والے مختلف مضامین اور ثقافتی و علمی مقالات جو نئی نسل میں مناسب شعور اور یکجہتی دوستی کے بیدار جذبوں کو نئی راہ دکھاتے ہیں، انتہائی قابل تحسین ہیں۔

❀❀❀

سلطان محمود شاہین، صدر ادارہ کشف القلوب، اسلام آباد

پیغام آشنا کا عنوان اقبال کے ایک شعر سے لیا گیا ہے۔ اقبال چونکہ اردو اور فارسی دانوں کی مشترکہ میراث ہیں اس لیے بجا طور پر امید کی جا سکتی ہے کہ یہ مجلہ پاکستان اور ایران کے مابین دوستی بھائی چارے اور خاص طور پر ثقافتی رشتوں کو فروغ دینے کے لیے ایک پل کا کام انجام دے گا۔ اس کے مقالات اور منظوم پیغامات میں ایک خاص کشش ہے۔

☆☆☆

☆☆☆

Marfat.com

چکیدہ فارسی

چکیدۀ مقالات فارسي این بخش وسیلۀ آقایان دکتر محمد صدیق شبلی، دکتر علیرضا نقوی، مرتضی موسوی، جناوید اقبال قزلباش و خانم دکتر شگفته موسوی از روی متن اردو ترجمه و وسیلۀ آقای عبدالرحیم حسن نژاد کارشناس فرهنگی رایزنی ویراستاری شده است.

Marfat.com

سهم نقش ایران در تمدن درهٔ سند

عنوان مقاله ایست که توسط پرفسور دکتر رضا مصطفوی سبزواری رایزن محترم فرهنگی سفارت جمهوری اسلامی ایران درسمینار گفتگو میان تمدنها که توسط وزارت فرهنگ دولت پاکستان باهمکاری یونیسکو دراسلام آباد برگزار شده بود، ارائه شده است. دراین مقاله مناسبات تاریخی، تمدنی، فرهنگی، هنری و ادبی در ازمنهٔ ماقبل مسیح تا اواخر قرن بیستم میلادی میان فلات ایران و درهٔ سند مورد مطالعه و بررسی قرارگرفته است و به گوشه هایی از پنهانیهای تاریخی سرزمینهای متمدن درّه سند در پیوند با ایران اشارت کرده و کوشیده است براساس متون معتبر ادب فارسی مانند شاهنامه فردوسی پیوندهای تاریخی میان ایران و سند را بکاود و سهم ایران را در تمدّن چشمگیر سند بنمایاند. این مقاله وسیلهٔ نمایندهٔ یونیسکو با عنوان "خیلی خیلی خوب" توصیف شده و از نویسنده با اهداء آرم زیبای سمینار قدردانی گردید. متن انگلیسی این مقاله در مجله *The Concept* شماره ۵، مه ۲۰۰۱ نیز به چاپ رسیده‌است.

مسابقهٔ سخنرانی میان دانشجویان دانشگاه ها

آقای دکترضیائی معاون ریاست دانشگاه علوم پزشکی و خدمات بهداشتی در تهران ضمن مصاحبه با ماهنامهٔ محجوبه چاپ تهران، گفت که مسابقه سخنرانی در مورد گفتگوی میان تمدنها، میان دانشجویان سراسرجهان درطی سال ۲۰۰۱ م درتهران تدارک دیده می شود و تابحال ۲۴ کشور جهت اعزام دانشجویان خود باین مسابقه اعلام آمادگی کرده‌اند.

تصادم یا تفاهم میان تمدنها

پرفسور سردار نقوی ضمن بحث پیرامون نیاز به درک اهمیت موضوع گفتگو

Marfat.com

میان تمدنها نظرات منفی برخی از نویسندگان خارجی دایر بر تصادم تمدنها را صریحاً تکذیب می‌کند و ضرورت ایجاد حسن تفاهم میان وارثان تمدنهای قدیم جهانی بوسیلهٔ انجام گفتگو میان آنان را بازگو می‌کند.

گفتگو میان تمدنها را به نویسندگان واگذارید

نویسنده این گفتار آقای جاوید اقبال قزلباش دراین مقاله عواملی راکه وی را به‌عنوان یک ادیب وادار می‌سازدکه احساسات خویش را درباره اوضاع و احوال دور و بر خویش به روی قرطاس منتقل سازد با کمال صراحت بیان داشته‌است. ایشان معتقد است که گفتگوی میان تمدنهای شرق و غرب با مبادله آثار نویسندگان می‌تواند بهتر صورت گیرد و در این راستا ادیبان و نویسندگان میتوانند نقش موثری را ایفاء کنند.

انسان، ابتلاء و عطا

در این مقاله نویسنده پرفسور دکتر شگفته موسوی در باب حکمت ابتلاء و فلسفهٔ عطای الهی بااستناد از آیات کلام الله مجید، احادیث رسول اکرم صلی الله علیه و آله وسلم، اقوال معصومین (ع) و متفکرانی نظیر امام خمینی (ره) و علامه اقبال بحث کرده و توجه خوانندگان گرامی را به نکات ارزنده معطوف داشته‌است.

حماسه کربلا

آقای شوکت علی رضا دراین مقاله تاریخچه کربلا را از زمان حضرت ابراهیم(ع) بازگو می کند و با بهره گیری از تسلط خود در نویسندگی، حادثه دلخراش را به نحو زیبایی تصویر می‌کشد. از این که حق و باطل همیشه در حال ستیزند، ایشان دراین مقاله نتیجه می‌گیرد که حادثه کربلا هم همیشه خود را تکرار خواهد نمود.

Marfat.com

عاطفۀ عشق و عرفان در شعر حضرت امام خمینی (ره)

آقای دکترانعام الحق کوثر در این مقاله بابیان فضائل علمی و خصائل شخصی و افکارعالی و احساسات عاطفی حضرت امام خمینی بنیانگذار جمهوری اسلامی ایران گزیده‌ای از اشعار امام را باترجمۀ منظوم اردو عرضه داشته است.

حسابی مردی باهزاران توانایی

اصل فارسی این مقاله توسط بنیاد پرفسور سید محمود حسابی تهیه و تنظم، و در روزنامه ایران (تهران) مورخ ۲۲ اسفند ماه ۷۹ به چاپ رسیده‌است. بخش فرهنگی رایزنی در راستای معرفی چهره های برتر و برجسته ایران و پاکستان برگردان اردوی آن را برای چاپ در فصلنامه پیغام آشنا برگزیده تا خوانندگان اردو زبان مجله بایکی از فرهیختگان برجسته عصرحاضر ایران آشنا شوند.
مطالب این معرفی در سه بخش شامل مراحل تحصیلی و مدارج علمی آن استاد گرانمایه ، اقدامات و خدمات علمی و اجرائی آن مبتکر ارزنده و آثار و تالیفات علمی آن نخبه فرزانه تنظیم شده است.

پیغام شعراقبال

دکتر سید محمد اکرم شاه ضمن مقایسه عصر مولوی باعصر علامه اقبال هردو مقطع را ازلحاظ اجتماعی یکسان می داند، زیرا دلسردی مسلمان در عصر مولوی به سبب یورش مغول و درعصر علامه اقبال به سبب سلطه استعمار غرب علیه شبه قاره بوجود آمده بود. علامه اقبال همانند مولوی امت اسلامی را بیدار کرد و به آنان درس خودشناسی و خود باوری داد و تنبلی و سستی را باعث مرگ ملتها توصیف کرد. وی در سال ۱۹۳۰ م ایده برپایی پاکستان را ارائه

Marfat.com

داد و به مسلمانان تاکید کرد که از سیاست و تمدن غرب کناره گیرند و دولت اسلامی را تاسیس کنند تا عظمت از دست رفته را دوباره بدست آورند. نویسنده معتقد است که ایران اول کشوری است که درخارج از شبه قاره مخاطب علامه اقبال قرارگرفت و اشعار او روحیه آزادی خواهی و استقلال طلبی را در آن کشور بوجود آورد تا ساختار شاهنشاهی دو هزار پانصد ساله از بین رفت. نویسنده در آخرمقاله اقتباسی چند از فرمایشات رهبرمعظم انقلاب اسلامی را درخصوص افکار علامه اقبال نیز نقل نموده‌است.

اهل فضل و کمال ناحیه اتک در زمان تیموریان هند و تألیفات فارسی آنان

راجه نور محمد نظامی در این مقاله ضمن معرفی شهر اتک احوال و آثار چهار تن از بزرگان آن جا و آثارشان راکه عبارتند از مولوی محمد یوسف اتکی و "منتخب التواریخ" او، و مولانا خواجه محمد زاهد اتکی و "قصة‌المشایخ" وی، و شیخ ملانصرالله اتکی وکتابش به عنوان "المرآة فی شرح اسماء المشکوة"، و شیخ عبدالشکور اتکی و دیوان او وکتاب "فاتح الدعا (فی) شرح سامع الدعا" تألیف وی را مورد بحث قرار داده است.

شمس العلماء میرزا قلیج بیگ

خانم زهرا میرزا ضمن بیان شرح احوال میرزا قلیج بیگ او را بعنوان شخصیتی بزرگ در زمینه ادب و فرهنگ در سرزمین سند معرفی می کند و به آثار فراوانش در زمینه های مختلف که باعث شد که صاحب نظران او را شکسپیر سند ، سعدی سند ، عمرخیام سند و بابای سند بنامند اشاره می کند.
نویسنده معتقد است که میرزا قلیج بیگ اولین کسی است که داستان‌نویسی ، مقاله نویسی و نمایشنامه نویسی را در زبان و ادبیات سندی معرفی نمود و به

Marfat.com

ترویج آن پرداخت و به تصحیح و چاپ شاه جو رسالوی شاه عبداللطیف بتایی همت گماشت و مجموعاً ۴۵۷ اثر از خود باقی گذاشت. دولت انگلیس از ره گذر قدردانی از خدمات ادبی ایشان به او مدال قیصرهند همراه با ساعتی طلایی اعطاء نمود و نیز او را به خطاب شمس‌العلماء سر افراز ساخت.

حافظ عبداللطیف اکبرآبادی

در این مقاله دکتر سید محمد ظاهرشاه ضمن بیان ابعاد مختلف شخصیت پیرو مراد خود حافظ محمد عبداللطیف اکبرآبادی از او بعنوان فردی دانشمند و شارح دیوان حافظ و مثنوی مولانا نام می‌برد و آثار گوناگون مشارالیه را معرفی می‌نماید از جمله شرح و تفسیر دواوین جامی و حافظ، شرح و توضیح کتابهای ادعیه و فتاوای شهابیه.

سرسوتی سرن کیف

دکتر آصفه زمانی، استاد دانشگاه لکهنو (هند) در این مقاله سرسوتی سرن کیف، سرایندهٔ فارسی زبان معاصر هندو را معرفی می‌کند و به تجزیه و تحلیل سبک شعری وی همت می‌گمارد. مقایسه ای نیز بین اشعار آن شاعر و شعر حافظ و سعدی و خیام و امیرخسرو دهلوی بعمل آورده به این نتیجه رسیده که شعر سرن کیف هم دارای رسائی لازم از لحاظ لفظ و معنا و فنون عروضی می باشد.

نقش فرهنگی مثنوی مولانا

پروفسور جیلانی کامران در این مقاله می‌گوید که روزگار موجب پرورش طبایع و احساسات و عواطف نویسندگان و ادبا می‌شود و آنان را به خلق آثار

Marfat.com

وادار می‌سازد. او در این ضمن به بیان آثار خلق شده توسط اندیشمندان جهان در دوره‌های مختلف می‌پردازد و از جمله به گوته شاعر گرانمایه آلمان که کتاب "فاوست" را در دوره احیای اروپا نوشته‌است اشاره می‌کند و یاد آور می‌شود که مثنوی معنوی مولوی نیز که پس از حمله تاتار و سقوط بغداد و متزلزل شدن جایگاه تمدن اسلامی و کشته شدن میلیونها نفر که آسیب شدیدی برروحیه انسانها وارد ساخت، سروده شد و بدینوسیله مولانا روحیه انسانها را بازسازی نمود. به‌نظر نویسنده قرآن همین وضعیت را برای انسانها یک خسارت می داند و مولوی آنرا به صدای غول تشبیه می‌کند و سعی دارد با ایجاد امید به رحمانیت خداوند متعال و احیای اعتماد به نفس، روحیه انسانها را ترمیم سازد و آنها را به آینده‌شان امیدوار سازد و این عمل او سبب تولد دور جدیدی از زندگی تمدن انسانی گردید.

نفوذ فارسی در زبان و ادب سرزمین بنگال

در این مقاله پرفسور ام سلمی (دانشگاه داکا) سیر تاریخی زبان و ادبیات بنگالی از ازمنهٔ قدیم تا دوره معاصر مورد بررسی قرارداده وعلایق و مناسبات فرهنگی و ادبی میان ایران و بنگال را در ادوار مختلف برشمرده و دراین رهگذر از نویسندگان و سخنوران و معلمان و مروجان فارسی در سرزمین بنگال یادی کرده و با نقل کردن برخی از نمونه های شعری سرایندگان محلی و با نقل ضرب‌المثلها و مشابهتهایی که از حیث لفظی و محتوائی و قواعد دستوری در زبانهای فارسی و بنگالی وجود دارد تاثیر زبان فارسی را در زبان و ادب بنگال بوضوح نشان داده‌است.

ادبیات فارسی در بلتستان

در این مقاله آقای محمد حسن حسرت ضمن معرفی زبان بلتی آنرا یکی از زبانهای تبتی قدیم می داند و اثرات زبان و فرهنگ فارسی راکه از طریق مبلغین

Marfat.com

و عرفای ایرانی در قرن چهاردهم میلادی صورت گرفته‌است مورد بررسی قرار می‌دهد. نویسنده در این خصوص به تاثیر رسوم مختلف ایرانی از جمله سوگواری امام حسین (ع)، عید نوروز، رسم الخط فارسی و موسیقی دربلتستان اشاره می‌کند و ایشان در ادامه مقاله خود میگوید که حتی امروزه نیز در مساجد و خانقاههای بلتستان، عربی و فارسی مورد استفاده قرار می‌گیرد و تاثیر زبان فارسی در ادبیات معاصر بلتستان و فنون شعری و صناعات ادبی آن بوضوح آشکار است.

پژوهشی در ماده تاریخ سرائی فارسی در شبه قاره

آقای سید محمد عبدالله قادری دراین مقاله ماده تاریخهای حایز اهمیت علمی را که طی چند قرن اخیر توسط سخنسرایان فارسی و اردو در سراسر منطقه شبه قاره سروده شده به نحو شایسته معرفی می‌نماید.

مجموعه شعرگل محمد ناطق مکرانی

دکتر سلطان الطاف علی در این مقاله به شرح احوال و افکار گل محمد ناطق مکرانی شاعر معروف فارسی گوی بلوچستان، می‌پردازد و دراین خصوص به کتاب جوهر معظم، مجموعه شعری این شاعر که توسط بلوچی اکادمی کویته چاپ شده است، اشاره می‌کند و ویژگیهای شعری ناطق مکرانی را بر می‌شمارد. نویسنده با نقل اشعاری چند از شاعر مزبور که دارای مضامینی از جمله صفاء و صمیمیت و انسان دوستی است، به بیان شکایت شاعر از اوضاع نامساعد روزگار می‌پردازد و می‌گوید که هنرمندان عالم همواره مورد بی مهری و قدرناشناسی قرار می‌گیرند و گل محمد ناطق مکرانی هم از این امر مستثنی نبود.

Marfat.com

جامِ وفا

خانم فائزه زهرا میرزا دراین مقاله به بررسی ابعاد مختلف کتاب جام وفا ک
مجموعه اشعار آقای پروفسور مقصود جعفری است و اخیراً توسط انجمن
فارسی اسلام‌آباد به چاپ رسیده می پردازد و اشعار مجموعه را دلپذیر، دارای
سلاست و روانی توصیف می‌کند.

Marfat.com

PAYGHĀM-E-ĀSHNA

Islamabad-Pakistan

A
Quarterly Journal
of the
Cultural Consulate
of the
Islamic Republic of Iran
With a Focus
on the
Common Cultural Heritage
of Iran and the
Countries of the
South Asian Region

Vol. II, Serial No. 5-6
Winter 1379-Spring 1380 Shamsi
June 2001

Marfat.com